انتخاب

مرزا محمد ہادی رسوا

مُرتبۂ

محمد حسن

اترپردیش اردو اکادمی
لکھنؤ

سلسلۂ مطبوعات: ۲۴۹

انتخاب
مرزا محمّد ہادی رسوا

مرتّبہ
محمد حسن

اتر پردیش اردو اکادمی
لکھنؤ

© اتر پردیش اردو اکادمی

انتخاب مرزا محمد ہادی رسوا

محمد حسن

پہلا اڈیشن ۱۹۸۸

تعداد ایک ہزار

قیمت دس روپے

رام کرشن ورما، سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی نے میسرس نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ (فیض آباد) سے چھپوا کر ہلہرہ ہاؤس، قیصر باغ، لکھنؤ سے شائع کیا۔

پیش لفظ

بعض فن کار اپنی کسی ایک تخلیق سے حسن قبول کی اس منزل پر پہنچ جاتے ہیں جہاں زمانے کی نیرنگیاں بھی باریاب نہیں ہو پاتیں۔ امراؤ جان ادا اور مرزا رسوا کا رشتہ صرف مصنف اور فن کار کا رشتہ نہیں ہے بلکہ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک کا ذکر دوسرے کے ذکر کے بغیر سپاٹ یا مبہم رہے گا۔ امراؤ جان ادا نے مرزا رسوا کی دوسری تخلیقات کی اہمیت تو کم نہیں کی لیکن ان سے استفادہ کرنے والوں کا حلقہ ضرور محدود کر دیا ہے، وہ صرف ایک بڑے ناول نگار نہیں تھے بلکہ وہ ایک عظیم مفکر، دانش ور اور اسکالر تھے۔ سائنس سے لے کر تنقید تک کون سا ایسا شعبہ ہے جو ان کی گرفت میں نہ رہا ہو۔

ہمارے معتبر نقاد پروفیسر محمد حسن کو اس باب میں اولیت حاصل ہے کہ انھوں نے عہد حاضر کو مرزا رسوا کی وسعت مطالعہ سے روشناس کرایا۔ ان کی کتاب "مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات" کی قدر و قیمت سے کون واقف نہیں ہے۔ اب انھوں نے اکادمی کی درخواست پر مرزا رسوا کی تخلیقات کا نمائندہ انتخاب مرتب کیا، اور اس پر جامع مقدمہ لکھا۔

امید ہے کہ اکادمی کی دوسری مطبوعات کی طرح زیر نظر انتخاب کو بھی حسن قبول ملے گا۔

محمود الٰہی
چیرمین، مجلس انتظامیہ

اتر پردیش اردو اکادمی
لکھنؤ۔ ۱۰ر جنوری ۱۹۸۸

ترتیب

- تعارف ۵
- انتخاب از اُمراؤ بمان ادا ۷
- اقتباس 'شریف زادہ' ۵۶
- اقتباس، ذات شریف' ۷۷
- اقتباسات 'مرقع لیلیٰ مجنوں' ۱۴۲

تعارف

مرزا محمد ہادی رسوا (۱۸۵۷ء تا ۱۹۳۱ء) اردو ادب کی بڑی رنگارنگ شخصیت ہیں ان کا ناول امراؤ جان آدا اردو کے افسانوی ادب میں ایک تاریخ ساز کارنامہ ہے۔ لیکن یہ ان کے کمالات کا صرف ایک پہلو ہے۔ وہ نہایت کامیاب مترجم تھے۔ باکمال ڈراما نگار تھے۔ خوش فکر شاعر تھے۔ فلسفے، علم کیمیا اور انجینئرنگ میں ماہر تھے۔ صحافی تھے۔ مذہبی متکلمین میں بھی ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ غرض ان کے کمالات کا دائرہ مختلف علوم و فنون تک پھیلا ہوا ہے۔

مرزا محمد ہادی ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد آغا محمد تقی فن سپہ گری میں ماہر تھے۔ مرزا محمد ہادی کی عمر ۱۵۔ ۱۶ سال سے زیادہ نہ تھی کہ والدین کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اس عمر تک انھوں نے فارسی کی نصابی کتابیں اور عربی صرف و نحو کی کتابیں پڑھ لی تھیں۔ خالہ اور ماموں نے ان کی آبائی جائیداد پر قبضہ کر لیا اور ان کی گزر بسر مکانات کے کرایے سے ہوتی رہی۔ پنجاب سے منشی عالم کا امتحان پاس کیا اور اس کے بعد انٹرنس کے امتحان میں کامیاب ہوئے بعد کو پنجاب سے بی اے کا امتحان پاس کیا اور رڑکی سے انجینئرنگ کا ڈپلوما لیا اور ریلوے میں اوورسیر مقرر ہوئے۔ اسی زمانے میں علم کیمیا کا شوق ہوا۔ اوورسیر کی ملازمت ترک کر کے لکھنؤ چلے آئے اور کرسچین کالج میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ گھر پر علم کیمیا کے مختلف آلات اکٹھے کر کے ایک ذاتی لیبارٹیری قائم کی۔

اسی زمانے میں کیمیا سے عملی دلچسپی کی بنا پر کالج سے بھی علیحدگی اختیار کر لی اب مالی دقتوں کی وجہ سے ناول نگاری کی طرف توجہ کی اور خاص طور پر امین آباد لکھنؤ کے ناول فروش مہادیو پرشاد کی فرمائش پر ناول لکھنے شروع کیے۔ امراؤ جان آدا۔

شریف زادہ اور ذات شریف خاص طور پر مشہور ہوئے۔

کچھ دنوں بعد بغیر تنخواہ کے لمبی چھٹی لے کر حیدر آباد چلے گئے۔ وہاں سے واپس آئے تو پھر کرسچین کالج میں استاد ہو گئے۔ اب مذہبیات سے دل چسپی ہوئی اور رسالہ "الحکم" اور کچھ عرصے بعد رسالہ "جن" نکالنا شروع کیا۔ ۱۹۰۷ء میں اردو شارٹ ہینڈ ایجاد کیا اور اردو ٹائپ رائٹر کا "کی بورڈ" مرتب کیا۔ حیدر آباد کا دوبارہ سفر کیا اور دارالترجمہ سے متعلق ہو گئے۔ وہاں انھوں نے اہم فلسفیانہ اور سائنسی کتابوں کے اردو ترجمے کیے۔ مرزا محمد ہادی رسوا کا انتقال ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو حیدر آباد میں ہوا اور وہیں ترپ بازار قبرستان میں دفن ہوئے۔

ان کی تصانیف میں امراؤ جان ادا، شریف زادہ، ذات شریف، افشائے راز ناولوں کے علاوہ اہم یونانی مصنفین کے ڈرامے، فلسفیانہ رسالے، غزلیات، قصائد، مثنویاں اور تنقیدی مراسلات شامل ہیں۔

زیر نظر انتخاب میں ان کے بعض تصانیف کے ایسے اقتباسات یک جا کر دیئے گئے ہیں جن سے مرزا کے طرز فکر اور اسلوب بیان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مرزا کی ادبی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے اردو کے افسانوی ادب کو نیا موڑ دیا اور سماجی اصلاح کے دور میں معاشرت ہی نہیں فرد کی باطنی کشمکش اور بدلتے ہوئے سماجی تقاضوں سے ہم آہنگی پر زور دیا۔ ان کا نقطۂ نظر خواہ تخلیقی ادب ہو یا تنقیدی ادب ایک روشن خیال اور خود آگاہ اور ارتقا پذیر ذہن رکھنے والے مفکر اور مصنف کا نقطۂ نظر ہے۔ امید ہے کہ ان اقتباسات سے ان کی شخصیت کے نمائندہ پہلو روشن ہو سکیں گے۔

محمد حسن

انتخاب از

امراؤ جان ادا

لطف ہے کون سی کہانی میں
آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی

سنیے مرزا رسوا صاحب۔ آپ مجھ سے کیا چھیڑ چھیڑ کے پوچھتے ہیں۔ مجھ کم نصیب کی سرگزشت میں ایسا کیا مزا ہے جس کے آپ مشتاق ہیں۔ ایک ناشاد نامراد، آوارہ وطن، خانماں برباد، ننگِ خاندان، عارِ دو جہاں کے حالات سن کے مجھے ہرگز امید نہیں کہ آپ خوش ہوں گے ——— اچھا سنیے اور اچھی طرح سنیے!

باپ دادا کا نام لے کے اپنی سرخ روئی جتانے سے فائدہ کیا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے یاد بھی نہیں، ہاں اتنا جانتی ہوں کہ فیض آباد میں شہر کے کنارے کسی محلہ میں میرا گھر تھا۔ میرا مکان پختہ تھا۔ آس پاس کچھ کچے مکان کچھ جھوپڑے، کچھ کھپریلیں۔ رہنے والے بھی ایسے ہی ویسے لوگ ہوں گے۔ کچھ بھشتی، کچھ نائی، دھوبی، کہار۔ میرے مکان کے سوا ایک اونچا گھر اس محلہ میں اور بھی تھا۔ اس مکان کے مالک کا نام دلاور خاں تھا۔

میرے ابا بہو بیگم صاحبہ کے مقبرے پر نوکر تھے۔ معلوم نہیں کاہے میں اسم تھا، کیا تنخواہ تھی۔ اتنا یاد ہے کہ لوگ ان کو جمعدار کہتے تھے۔

دن بھر میں اپنے بھائی کو کھلایا کرتی تھی اور وہ بھی مجھ سے اس قدر ہلا ہوا تھا

کہ دم بھر کے لیے نہ چھوڑتا تھا۔

ابا جب شام کو نوکری پر سے آتے تھے اس وقت کی خوشی ہم بھائی بہنوں کی کچھ نہ پوچھیے۔ میں کمر سے لپٹ گئی، بھائی ابا ابا کر کے دوڑا دامن سے چمٹ گیا۔ ابا کی باچھیں مارے خوشی کے کھلی جاتی ہیں۔ مجھ کو چمکارا پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ بھیا کو گود میں اٹھالیا، پیار کرنے لگے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ کبھی خالی ہاتھ گھر نہ آتے تھے۔ کبھی دو کتارے ہاتھ میں ہیں کبھی بتاسوں یا تل کے لڈوؤں کا دونا ہاتھ میں ہے۔ اب اس کے حصے لگائے جا رہے ہیں۔ اس وقت بھائی بہنوں میں کس مزے کی لڑائیاں ہوتی تھیں۔ وہ کتارا چھینے لیے جاتا ہے، میں مٹھائی کا دونا ہتھیائے لیتی ہوں۔ اماں سامنے کھپریل میں بیٹھی کھانا پکا رہی ہیں۔ ابا اِدھر آ کے بیٹھے نہیں اُدھر میرے تقاضے شروع ہو گئے۔ ابا اللہ گڑیاں نہیں لائے۔ دیکھو میرے پاؤں کی جوتی کیسی ٹوٹ گئی ہے تم کو تو خیال ہی نہیں رہتا، لو ابھی تک میرا طوق سنار کے یہاں سے بن کے نہیں آیا۔ چھوٹی خالہ کی لڑکی کی دودھ بڑھائی ہے، بھئی میں کیا پہن کے جاؤں گی؟ چاہے کچھ ہو عید کے دن تو میں نیا جوڑا پہنوں گی، ہاں میں تو نیا پہنوں گی۔ جب اماں کھانا پکا چکیں، مجھے آواز دی۔ میں گئی، روٹی کی ٹوکری اور سالن کی پتیلی اٹھا لائی۔ دسترخوان بچھا، اماں نے کھانا نکالا، سب نے سر جوڑ کر کھانا کھایا۔ خدا کا شکر کیا۔ ابا نے عشا کی نماز پڑھی، سو رہے، صبح کو تڑکے ابا اٹھے، نماز پڑھی۔ اسی وقت میں کھڑک سے اٹھ بیٹھی پھر فرمائشیں شروع ہوئیں۔

"میرے ابا آج نہ بھولنا گڑیاں ضرور لیتے آنا۔ ابا شام کو بہت سارے امرود اور نارنگیاں لانا....."

ابا صبح کو نماز پڑھ کے وظیفہ پڑھتے ہوئے کوٹھے پر چڑھ جاتے تھے۔ کبوتروں کو کھول کے دانہ دیتے تھے۔ ایک دو ہوا میں اڑاتے تھے۔ اتنے میں اماں جھاڑو بہارو سے فراغت کر کے کھانا تیار کر لیتی تھیں کیوں کہ پہر دن چڑھنے سے پہلے ہی نوکری پر چلے جاتے تھے۔ اماں سینا پرونا لے کے بیٹھ جاتی تھیں۔ میں بھیا کو لے کے

کہیں محلہ میں نکل گئی یا دروازے پر املی کا درخت تھا وہاں چلی گئی، ہمجولی لڑکیاں لڑکے جمع ہوئے۔ بھیا کو بٹھا دیا خود کھیل کود میں مصروف ہوگئی ہائے کیا دن تھے، کسی بات کی فکر ہی نہ تھی۔ اچھے سے اچھا کھاتی تھی اور بہتر سے بہتر پہنتی تھی کیوں کہ ہمجولی لڑکے لڑکیوں میں کوئی مجھ کو اپنے سے بہتر نظر نہ آتا تھا۔ دل کھلا ہوا نہ تھا۔ نگاہیں کھٹی ہوئی نہ تھیں۔ جہاں میں رہتی تھی وہاں کوئی مکان میرے مکان سے اونچا نہ تھا اور سب ایک کٹھریا یا کھپریل میں رہتے تھے۔ میرے مکان میں آمنے سامنے دو دالان تھے۔ صدر کے دالان کے آگے کھپریل پڑی ہوئی، ادھر اُدھر دو کوٹھریاں تھیں۔ سامنے دالان کے ایک باورچی خانہ تھا، دوسری طرف کوٹھے کا زینہ، کوٹھے پر ایک کھپریل دو کوٹھریاں کھانے پکانے کے برتن ضرورت سے زیادہ تھے، دو چار دریاں چاندنیاں بھی تھیں۔ ایسی چیزیں محلہ کے لوگ ہمارے گھر سے مانگنے آتے تھے۔ ہمارے گھر میں بھشتی پانی بھرتا تھا۔ محلہ کی عورتیں خود ہی کنوئیں سے پانی بھر لاتی تھیں۔ ہمارے ابا جب گھر سے وردی پہن کے نکلتے تھے لوگ انھیں جھک جھک کے سلامیں کرتے تھے میری اماں ڈولی پر سوار ہو کے مہمان جاتی تھیں۔ ہمسائیاں پاؤں پیدل ماری ماری پھرتی تھیں۔

صورت شکل میں بھی میں اپنی ہمجولیوں سے اچھی تھی۔ اگرچہ درحقیقت خوبصورتوں میں میرا شمار نہیں ہو سکتا مگر ایسی بھی نہ تھی جیسی اب ہوں۔ کھلتی ہوئی چمپئی رنگت تھی۔ ناک نقشہ بھی خیر کچھ ایسا برا نہ تھا۔ ماتھا کسی قدر اونچا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں بچپنے کے پھولے پھولے گال تھے، ناک اگرچہ ستواں نہ تھی مگر پچکی اور پھیپھری بھی نہ تھی۔ ڈیل ڈول بھی سن کے موافق اچھا تھا اگرچہ اب ویسی نہیں رہی۔ نازکوں میں میرا شمار نہ جب تھا نہ اب ہے۔ اس قطع پر پاؤں میں لال گلبدن کا پائجامہ چھوٹے چھوٹے پائچوں کا ٹول کا نیفہ، تینوں کی کرتی، تنزیب کی اوڑھنی، ہاتھوں میں چاندی کی تین تین چوڑیاں، گلے میں طوق، ناک میں سونے کی نتھنی۔ اور سب لڑکیوں کی نتھنیاں چاندی کی تھیں۔ کان ابھی تازے تازے چھدے تھے، ان میں صرف نیلے ڈورے پڑے تھے۔ سونے کی بالیاں بننے کو گئی تھیں۔

میری شادی میری پھوپھی کے لڑکے کے ساتھ ٹھہری ہوئی تھی۔ منگنی نو برس کے سن میں ہو گئی تھی۔ اب ادھر سے شادی کا تقاضہ تھا۔ میری پھوپھی نواب گنج میں بیاہی ہوئی تھیں۔ پھوپا ہمارے زمیندار تھے۔ پھوپھی کا گھر ہمارے گھر سے زیادہ بھرا پرا تھا۔ منگنی ہونے سے پہلے میں کئی مرتبہ اپنی ماں کے ساتھ وہاں جا چکی تھی۔ وہاں کے کارخانے ہی اور تھے۔ مکان تو کچا تھا مگر بہت وسیع۔ دروازے پر چھپر پڑے تھے۔ گائے بیل بھینسیں بندھی تھیں۔ گھی دودھ کی افراط تھی۔ اناج کی کثرت، بھٹوں کی فصل میں ٹوکروں بھٹے چلے آتے ہیں۔ کتاروں کی پھاندیاں کی پھاندیاں پڑی ہوئی ہیں اوکھ کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ کوئی کہاں تک کھائے۔

میں نے اپنے دولھا (یعنی جس کے ساتھ میری نسبت ٹھہری ہوئی تھی) کو بھی دیکھا تھا بلکہ ساتھ کھیلی تھی۔ ابا پورا جہیز کا سامان کر چکے تھے۔ کچھ روپے کی اور فکر تھی۔ رجب کے مہینے میں شادی کا تقرر ہو گیا تھا۔

رات کو ابا اماں میں جب میری شادی کی باتیں ہوتی تھیں میں چپکے چپکے سنا کرتی تھی اور دل ہی دل میں خوش ہوتی تھی۔ واہ میرے دولھا کی صورت کریمن (ایک دھنیے کی لڑکی کا نام تھا جو میرے ہمسن تھی) کے دولھا سے اچھی ہے۔ وہ تو کالا کالا ہے میرا دولھا گورا گورا ہے۔ کریمن کے دولھا کے منھ پر کیا بڑی سی داڑھی ہے، میرے دولھا کے ابھی مونچھیں بھی اچھی طرح نہیں نکلیں۔ کریمن کا دولھا ایک میلی سی دھوتی باندھے رہتا ہے، ماشی رنگی ہوئی مرزئی پہنے رہتا ہے۔ میرا دولھا عید کے روز کس ٹھاٹھ سے آیا تھا۔ سبز چھینٹ کا دگلہ، گلبدن کا پائجامہ، مصالحہ کی ٹوپی، مخملی جوتہ۔ کریمن کا دولھا سر میں ایک پھینٹا باندھے ہوئے ننگے پاؤں پھرتا ہے۔

غرض کہ میں اپنی حالت میں خوش تھی اور کیوں نہ خوش ہوتی کیوں کہ اس سے بہتر اور کوئی حالت میرے خیال میں نہ آسکتی تھی۔ مجھے اپنی تمام آرزوئیں بہت ہی جلد پوری ہوتی معلوم ہوتی تھیں۔

مجھے یاد نہیں کہ جب تک میں اپنے ماں باپ کے گھر میں رہی مجھے کوئی صدمہ پہنچا ہو۔

مگر ایک مرتبہ جب میری انگلی کا ایک چھلا چند اڈھیری کھیلنے میں جاتا رہا تھا، موا چاندی کا تھا، شاید ایک آنہ سے زیادہ کا نہ ہوگا۔ یہ اب کہتی ہوں، اس وقت اتنی تمیز کہاں تھی کہ قیمت کسی چیز کی مجھے معلوم ہی نہ تھی، اس چھلے کے لیے میں اتنی روئی کہ آنکھیں سوج گئیں۔ اماں سے دن بھر چھپایا آخر جب رات کو انھوں نے انگلی خالی دیکھی، مجھ سے حال پوچھا۔ اب کہنا ہی پڑا۔ اماں نے ایک طمانچہ میرے منھ پر مارا۔ میں چیخیں مار مار کے رونے لگی۔ ہچکیاں بندھ گئیں۔ اتنے میں ابا آگئے۔ انھوں نے مجھے چمکارا، اماں پر خفا ہوئے اس وقت مجھے تسکین ہوئی۔

بے شک ابا مجھے اماں سے زیادہ چاہتے تھے۔ ابا نے کبھی پھول کی چھڑی نہیں چھوائی۔ اماں ذرا ذرا سی بات پر مار بیٹھتی تھیں۔ اماں چھوٹے بھیا کو بہت چاہتی تھیں۔ چھوٹے بھیا کے لیے میں نے بہت مار کھائی مگر پھر بھی مجھے اس سے انتہا کی محبت تھی اماں کی ضد سے تو کبھی کبھی دو دو پہر میں نے گود میں نہیں لیا مگر جب ان کی آنکھ اوجھل ہوئی فوراً گلے سے لگا لیا۔ گود میں اٹھا لیا پیار کر لیا۔ جب دیکھا اماں آتی ہیں جلدی سے اتار دیا، اب وہ رونے لگا۔ اس پر اماں سمجھتی تھیں کہ میں نے رلا دیا، لگیں گھڑکیاں دینے۔

یہ سب کچھ تھا مگر جہاں میری انگلی دکھی اور اماں بے قرار ہوگئیں کھانے پینے کا ہوش نہیں، راتوں کو نیند حرام، کسی سے دوا پوچھتی ہیں کسی سے تعویذ منگاتی ہیں۔

میرے جہیز کے لیے اپنے ہاتھ گلے کا گہنا اتار کے ابا کے حوالے کیا۔ اس میں تھوڑی چاندی ملوا کے پھر سے بنوا دو۔ دو ایک عدد جو نئے بنے ہوئے ہیں ان کو اُجلوا دو۔ گھر بھر کے برتنوں میں سے دو چار رکھ لیے باقی نکال کے الگ کر دیے کہ ان پر قلعی کرا دو۔ بلکہ ابا نے کہا بھی کہ کچھ اپنے آئندہ کا بھی خیال رکھو۔ اماں نے کہا اوہ جی ہوگا! تمھاری بہن زمیندار کی بیوی ہیں وہ بھی تو جانیں کہ بھائی نے لڑکی کو کچھ دیا۔ لاکھ تمھاری بہن ہیں سسرال کا نام برا ہوتا ہے۔ میری لڑکی ننگی بوچی جائے گی تو لوگ طعنے دیں گے۔

مرزا رسوا صاحب! میں نے اپنے ماں باپ کے گھر اور بچپن کی حالت کا پورا نقشہ آپ کے سامنے کھینچ دیا ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر میں اُس عالم میں رہتی تو خوش رہتی یا ناخوش، اسے آپ خود قیاس کر سکتے ہیں۔ میری ناقص عقل میں تو یہ آتا ہے کہ میں اُسی حالت میں اچھی رہتی۔

ابتدا آوارگی کی جوشِ وحشت کا سبب
ہم تو سمجھے ہیں مگر ناصح کو سمجھائیں گے کیا

میں نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ جو ذات کی رنڈیاں ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا، جو کچھ نہ کریں کم ہے کیوں کہ وہ ایسے گھر اور ایسی حالت میں پرورش پاتی ہیں جہاں سوائے بدکاری کے اور کسی چیز کا مذکور ہی نہیں، ماں بہن جس کو دیکھتی ہیں اسی حالت میں ہے مگر یہ ماں باپ کی بیٹیاں جو اپنے گھروں سے نکل کے خراب ہو جاتی ہیں اُن کو وہاں مارے جہاں پانی نہ ملے۔

میرا حال جتنا میں بیان کر چکی ہوں اتنا ہی کہہ کے چھوڑ دوں اور اس کے بعد یہ کہہ دوں کہ بس اس کے بعد میں آوارہ ہو گئی۔ اس سے یہ خیال پیدا ہو گا کہ کمبخت اودماتی تھی۔ شادی ہونے میں دیر ہوئی۔ کسی سے آنکھ لگا کے نکل آئی، اُس نے چھوڑ دیا، کسی اور سے آشنائی کی، اس سے بھی نہ بنی۔ آخر رفتہ رفتہ یہی پیشہ ہو گیا۔ واقعی اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں نے اپنی زندگی میں بہت سی بہو بیٹیوں کو خراب ہوتے دیکھا اور سنا۔ اس کے سبب بھی کئی ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جوان ہو گئیں، ماں باپ شادی نہیں کرتے۔ دوسرے یہ کہ شادی اپنی پسند سے نہیں ہوتی، ماں باپ نے جہاں پایا وہیں جھونک دیا۔ نہ سن کا لحاظ کیا نہ صورت شکل دیکھی، نہ مزاج کا حال دریافت کیا، میاں سے نہ بنی نکل کھڑی ہوئیں یا جوانی میں سر پہ آسمان ٹوٹا، رانڈ ہو گئیں۔ صبر نہ ہو سکا دوسرا کر لیا یا بد صحبت ملی آوارہ ہو گئیں۔ مگر مجھ بد نصیب

ناشدنی کو بخت و اتفاق نے مجبور کر کے ایسے جنگل میں چھوڑا جہاں سوائے گمراہی کے کوئی راستہ ہی نہ تھا

دلاور خاں جس کا مکان ہمارے مکان سے تھوڑی دور پر تھا موا ڈکیتوں سے ملا ہوا تھا۔ لکھنؤ میں برسوں قید رہا۔ اسی زمانے میں نہیں معلوم کس کی سفارش سے چھوٹ آیا تھا۔ ابا سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ جب فیض آباد سے گرفتار ہوا تو محلہ سے اس کے چال چلن کی تحقیقات کے لیے لوگ طلب ہوئے ان میں ابا بھی تھے۔ آہ بے چارے یوں بھی دل کے سادے اور زبان کے سچے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ رانی والے صاحب نے ان کے ہاتھ میں قرآن دے کے پوچھا "دل جمعدار تم سچ کہے یہ کیسا آدمی ہے؟" ابا نے صاف صاف جو اس کا حال تھا کہہ دیا۔ انھیں کی گواہی پر دلاور خاں قید ہو گیا۔ یہ حال میں نے اپنی ماں سے سنا تھا۔ وہی کینہ اس کے دل میں چلا آتا تھا۔ اب کی جب قید سے چھوٹ کر آیا تو اس نے ابا کی ضد پر کبوتر پالے۔ ایک دن اس نے ابا کا کبوتر مارا۔ لینے کو گئے نہ دیا۔ ابا چار آنے دیتے تھے وہ آٹھ آنے مانگتا تھا۔ ابا تو نوکری پر چلے گئے جھٹ پٹے وقت خدا جانے میں کیوں نکلی تھی۔ دیکھتی کیا ہوں املی کے نیچے کھڑا ہوا ہے، کہنے لگا۔ چلو بیٹا تمھارے ابا پیسے دینے گئے تھے کبوتر لے لو۔ میں اس کے دم میں آ گئی ساتھ چلی گئی۔ جا کے جو دیکھتی ہوں گھر میں کانی چڑیا نہیں، اکیلا مکان پڑا ہے۔ ادھر میں گھر میں داخل ہوئی ادھر اس نے اندر سے کنڈی بند کر لی۔ چاہتی ہوں کہ چیخوں اس نے منہ میں گودڑ ٹھونس دیا۔ میرے دونوں ہاتھ رومال سے کس دیے۔ اس مکان کا ایک دروازہ دوسری طرف تھا مجھے زمین پر بٹھا کے آپ گیا وہ دروازہ کھولا اور پیر بخش کہہ کے آواز دی۔ پیر بخش اندر آیا۔ دونوں نے مل کر مجھے بیل گاڑی پر سوار کیا کہ بیل گاڑی چل نکلی۔ میں دم بخود رہ گئی تلے کی سانس تلے اوپر کی اوپر۔ کروں کیا کوئی بس نہیں، موذی کے جنگل میں ہوں۔ دلاور خاں بہلی کے اندر مجھ کو گھٹنوں کے نیچے دبائے ہوئے بیٹھا ہے۔ ہاتھ میں چھری ہے۔ موے کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ پیر بخش گاڑی ہانک رہا ہے۔ بیل ہیں کہ اڑے چلے جا رہے

ہیں۔ تھوڑی دیر میں شام ہوگئی۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ جاڑے کے دن تھے، سناٹے کی ہوا چل رہی تھی۔ سردی کے مارے میری بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ دم نکلا جاتا تھا۔ آنکھوں سے باران جاری تھا۔ دل میں یہ خیال آتا ہے ہائے کس آفت میں پھنسی۔ ابا نوکری پر سے آئے ہوں گے، مجھے ڈھونڈھتے ہوں گے۔ اماں پیٹ رہی ہوں گی۔ چھوٹا بھائی کھیل رہا ہوگا۔ اسے کیا معلوم بہن کس آفت میں ہے۔ ماں باپ، بھائی، مکان کا دالان انگنائی باورچی خانہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ یہ سب خیالات ایک طرف تھے اور جان کا خوف ایک طرف۔ دلاور خاں گھڑی گھڑی چھری دکھاتا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کوئی دم میں یہ چھری میرے کلیجے کے پار ہوگی۔ گو ڈر اب میرے منھ میں نہ تھا مگر مارے ڈر کے منھ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ ادھر میرا تو یہ حال تھا اُدھر دلاور خاں اور پیر بخش میں ہنس ہنس کے باتیں ہو رہی تھیں۔ میرے ماں باپ پر اور مجھ پر بات بات میں گالیاں پڑتی جاتی تھیں۔

دلاور خاں:۔ دیکھا بھائی پیر بخش! سپاہی کے پوت بارہ برس کے بعد اپنا بدلہ لیتے ہیں۔ اب کیسا ۔ ۔ ۔ ۔ تلملاتا پھرتا ہوگا۔

پیر بخش:۔ بھئی تم نے بے شک اس مثل کو اصل کر دکھایا۔ بارہ برس تو ہوئے ہوں گے تمھیں قید ہوئے۔

دلاور خاں:۔ پورے بارہ برس ہوئے، بھائی لکھنؤ میں کیا کیا مصیبتیں اٹھائی ہیں خیر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ بھی تو کوئی دن یاد کرے گا۔ یہ تو میرا پہلا وار تھا۔ میں تو اس کو جان سے ماروں گا۔

پیر بخش:۔ کیا یہ بھی ارادہ ہے؟

دلاور خاں:۔ تم سمجھتے کیا ہو، جان سے نہ مارا ہو تو پٹھان کا تخم نہیں۔

پیر بخش:۔ بھئی تم قول کے سچے ہو جو کہو گے کر دکھاؤ گے

دلاور خاں:۔ دیکھنا۔

پیر بخش :۔ اور اسے کیا کرو گے ؟

دلاور خاں :۔ کریں گے کیا یہیں کہیں مار کے نالے میں توپ دو۔ راتوں رات گھر چلے چلو۔

یہ بات سن کر مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو تھم گئے۔ دل میں ایک دھچکا لگا۔ منکا ڈھل گیا۔ ہاتھ پاؤں ڈال دیے۔ یہ حال دیکھ کے بھی موے کٹر کو ترس نہ آیا اور ایک گھونسہ زور سے میرے کلیجے پر مارا کہ میں بلبلا گئی۔ قریب تھا کہ گر پڑوں۔

پیر بخش :۔ اسے تو مار ڈالو گے اور ہمارا روپیہ۔

دلاور خاں :۔ گلے گلے پانی۔

پیر بخش :۔ کہاں سے دو گے ہم تو کچھ اور ہی سمجھے تھے

دلاور خاں :۔ گھر چلو۔ کہیں سے نہ ہو سکے گا تو کبوتر بیچ کے دے دوں گا

پیر بخش :۔ تم بے عقل ہو کبوتر کیوں بیچو۔ ہم نہ ایک بات بتائیں۔

دلاور خاں :۔ کہو

پیر بخش :۔ ارماں لکھنؤ میں چل کے اسی چھوکری کے کوڑے کر لو۔

جب سے اپنے مرنے کا یقین ہو گیا تھا مجھے ان دونوں موذیوں کی باتیں کانوں سے اچھی طرح سنائی نہ دیتی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی خواب میں باتیں کر رہا ہے۔

پیر بخش کی بات سن کے میرے دل کو پھر اپنی زندگی کا کچھ آسرا بندھا۔ دل ہی دل میں پیر بخش کو دعائیں دینے لگی مگر اب یہ انتظار ہے کہ دیکھوں یہ موذی کیا کہتا ہے۔

دلاور خاں :۔ اچھا دیکھا جائے گا ابھی چلے چلو۔

پیر بخش :۔ یہاں ذرا ٹھہر نہ جائیں۔ وہ سامنے درخت کے نیچے آگ جل رہی ہے، تھوڑی آگ لے آئیں تو حقہ بھریں۔

پیر بخش تو آگ لینے گیا مجھے یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں پیر بخش کے آتے آتے یہ میرا کام نہ تمام کر دے۔ جان کا خوف برا ہوتا ہے۔ اکبارگی زور سے چیخ ماری۔ چیخ کا

مارنا تھا کہ دلاور خاں نے دو تین طمانچے میرے منھ پر کس کس کے لگائے۔ حرام زادی چپ نہیں رہتی، ابھی چھری بھونک دوں گا۔۔۔۔ فیل کرتی ہے۔۔۔۔۔

پیر بخش:۔ (ابھی تھوڑی ہی دور گیا ہوگا) نہیں بھئی نہیں، ایسا کام نہ کرنا تمھیں ہمارے سر کی قسم ارماں ہمیں تو آ لینے دو۔

دلاور خاں:۔ اچھا جاؤ آگ تو لے آؤ۔

پیر بخش گیا اور تھوڑی دیر کے بعد آگ لے کے آیا۔ حقہ بھرا۔ دلاور خاں کو دیا۔

دلاور خاں:۔ (ایک کش حقہ کا پی کے) تو یہ کتنے تک بک جائے گی؟ اور بیچے گا کون؟ ایسا نہ ہو کہیں پکڑے جائیں تو اور مشکل ہو۔

پیر بخش:۔ اس کا ہمارا ذمہ۔ ہم تو بیچ دیں گے۔ ارے میاں تمھاری باتیں۔ پکڑے گا کون لکھنؤ میں ایسے معاملے دن رات ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے سالے کو جانتے ہو؟

دلاور خاں:۔ کریم؟

پیر بخش:۔ ہاں! اس کی روٹی اسی پر ہے، بیسوں لڑکے لڑکیاں پکڑ لے گیا۔ لکھنؤ میں جا کے دام کھرے کر لیے۔

دلاور خاں:۔ آج کل کہاں ہے؟

پیر بخش:۔ کہاں ہے؟ لکھنؤ میں گومتی اس پار اس کی سسرال ہے، وہیں ہوگا۔

دلاور خاں:۔ بھلا لڑکا لڑکی کتنے کو بکتے ہیں؟

پیر بخش:۔ جیسی صورت ہوئی۔

دلاور خاں:۔ بھلا یہ کتنے کو بک جائے گی؟

پیر بخش:۔ سو ڈیڑھ سو جیسی تمھاری تقدیر ہوئی۔

دلاور خاں:۔ بھائی کی باتیں۔ سو ڈیڑھ سو۔ اس کی صورت ہی کیا ہے سو بھی تو بہت ہے۔

پیر بخش:۔ اچھا اس سے کیا۔ لے تو چلو مار ڈالنے سے کیا فائدہ۔

اس کے بعد دلاور خاں نے پیر بخش کے کان میں کچھ جھک کے کہا جس کو میں نے نہیں سنا۔ پیر بخش نے جواب دیا وہ تو ہم سمجھے ہی تھے، تم کیا بے وقوف ہو۔

رات بھر گاڑی چلا کی۔ میری جان سانسے میں تھی۔ موت آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی، طاقت سلب ہو گئی تھی۔ بدن سن ہو گیا تھا۔ آپ نے سنا ہو گا نیند سولی پر بھی آتی ہے۔ تھوڑی دیر میں آنکھ لگ گئی۔ ترس خدا کر کے پیر بخش نے بیلوں کا کمبل اڑھا دیا۔ رات کو کئی مرتبہ چونک چونک پڑی۔ آنکھ کھل جاتی تھی مگر ڈر کے مارے چپکی پڑی تھی۔ آخر ایک مرتبہ ڈرتے ڈرتے منھ پر سے کمبل سرکا کے جو دیکھا معلوم ہوا میں گاڑی میں اکیلی ہوں۔ پردے سے جھانک کے دیکھا سامنے کچھ کچے کچے مکان ہیں، ایک بنیے کی دکان ہے۔ دلاور خاں اور پیر بخش کچھ خرید رہے ہیں۔ بیل سامنے برگد کے درخت کے نیچے بھوسہ کھا رہے ہیں۔ دو تین گنوار الاؤ کے پاس بیٹھے ہوئے تاپ رہے ہیں، ایک چلم پی رہا ہے۔ اتنی دیر میں پیر بخش نے گاڑی کے پاس آکر تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے دیے۔ میں رات بھر کی بھوکی تھی کھانے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لوٹا پانی لا کے دیا۔ میں نے تھوڑا سا پیا۔ پھر چپکی ہو کے پڑ رہی۔

بڑی دیر تک گاڑی یہاں رکی رہی پھر پیر بخش نے بیل جوتے۔ دلاور خاں حقہ بھر کے میرے پاس آ بیٹھا۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ آج دن کو مجھ پر زیادہ سختی نہیں ہوئی نہ دلاور خاں کی چھری نکلی نہ مجھ پر گھونسے پڑے نہ گھڑکیاں۔ دلاور خاں اور پیر بخش دونوں جگہ جگہ پر حقہ بھر بھر کے پیتے تھے باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ جب باتیں کرتے کرتے تھک گئے کچھ گانے لگے۔ ایک گاتا ہے دوسرا چپکا سن رہا ہے۔ سن کیا رہا ہے سوچ رہا ہے کہ اب کیا بات نکالوں۔ پھر کوئی بات نکل آئی۔ اس گفتگو میں اکثر ایسا بھی ہوا کہ آپس میں گالی گلوج ہونے لگی۔ آستینیں چڑھ گئیں، کمریں کسی جانے لگیں، ایک گاڑی پر سے کود پڑتا ہے دوسرا وہیں گلا گھونٹنے کو تیار ہے۔ پھر کسی بات پر دونوں ڈھیلے پڑ گئے۔ بات رفت گزشت ہوئی۔ پھر ملاپ ہوا، دوستی کی باتیں ہونے لگیں گویا کبھی لڑے ہی نہ تھے۔

ایک:۔ ہمارے تمھارے درمیان لڑائی کی ہی کیا بات تھی؟

دوسرا:۔ بات ہی کیا تھی؟

پہلا:۔ اچھا تو پھر اس بات کو جانے دو۔

دوسرا:۔ جانے دو۔

اتفاقاتِ زمانہ سے یہ کچھ دور نہیں
یوں بھی ہوتا ہے کہ بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں

بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں اور پھر کب کے بچھڑے ہوئے۔ وہ جن کے ملنے کا سان گمان بھی نہ ہو۔ ایک دن کا واقعہ سنیے۔ کان پور میں رہتے ہوئے کوئی چھ مہینے گزر گئے ہیں۔ اب شہرت کی یہ حد پہنچی ہے کہ بازاروں اور گلیوں میں میری گائی ہوئی غزلیں لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ شام کو میرے کمرے میں بہت اچھا مجمع رہتا ہے۔

گرمیوں کا دن ہے۔ کوئی دو بجے کا وقت ہوگا، میں اپنے پلنگ پر اکیلی لیٹی ہوں۔ ماما باورچی خانے میں خراٹے لے رہی ہے۔ ایک خدمت گار کمرے کے باہر بیٹھا پنکھے کی ڈوری کھینچ رہا ہے۔ خس کی ٹٹیاں خشک ہوگئی ہیں۔ میں آدمی کو آواز دیا ہی چاہتی تھی کہ پانی چھڑک دے کہ اتنے میں کمرے کے نیچے کسی نے آکر پوچھا۔ لکھنؤ سے جو رنڈی آئی ہے اس کا یہی کمرہ ہے؟ درگا بنیے (جس کی دکان نیچے تھی) نے جواب دیا ہاں یہی ہے۔ پھر دریافت کیا دروازہ کہاں ہے؟ اس نے بتا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک بڑی بی کوئی ستر برس کا سن، گوری سی، منھ پر جھریاں پڑی ہوئیں، بال جیسے روئی کا گالا، کمر جھکی ہوئی، سفید ململ کا دوپٹہ، تن زیب کا کرتہ، نین سکھ کا پائجامہ بڑے بڑے پائچوں کا پہنے، ہاتھوں میں چاندی کے موٹے موٹے کڑے، انگلیوں میں انگوٹھیاں، جریب ہاتھ میں، ہانپتی کانپتی ہوئی آئیں اور سامنے فرش پر بیٹھ گئیں۔ ایک کالا سا لڑکا کوئی دس بارہ برس کا ان کے ساتھ تھا۔ وہ کھڑا رہا۔

بڑی بی:۔ لکھنؤ سے تمھیں آئی ہو؟

میں:۔ جی ہاں۔ اتنا کہہ کے میں پلنگ سے نیچے اتر آئی، پاندان آگے کھسکایا، آدمی کو حقہ کے لیے آواز دی۔

بڑی بی :۔ ہماری بیگم نے تمھیں یاد کیا ہے۔ لڑکے کی سال گرہ ہے، زنانہ جلسہ ہوگا۔ تمھارا مجرا کیا ہے؟

میں :۔ بیگم صاحبہ مجھ کو کیا جانیں؟

بڑی بی :۔ اے تمام شہر میں تمھارے گانے کی دھوم ہے۔ دوسرے تمھارے بلانے کا یہ بھی ایک سبب ہے کہ بیگم صاحبہ بھی لکھنؤ کی رہنے والی ہیں۔

میں :۔ اور آپ بھی تو لکھنؤ کی ہیں۔

بڑی بی :۔ تم نے کیوں کر جانا؟

میں :۔ کہیں بات چیت کا قرینہ چھپا رہتا ہے۔

بڑی بی :۔ ہاں میں بھی وہیں کی رہنے والی ہوں۔ اچھا تو اپنا مجرا تو بتاؤ۔ ابھی بہت کام پڑا ہے۔ مجھے دیر ہوتی ہے۔

میں :۔ مجرا تو میرا کھلا ہوا ہے۔ سب جانتے ہیں۔ پچاس روپیہ لیتی ہوں مگر بیگم صاحب لکھنؤ کی رہنی والی ہیں اور انھوں نے قدر کر کے بلایا ہے تو ان سے کچھ نہ لوں گی۔ جلسہ کب ہے؟

بڑی بی :۔ آج شام کو۔ اچھا تو یہ روپیہ کھچڑی کا تو لو۔ باقی وہاں آ کے سمجھ لینا۔

میں :۔ (روپیہ لے لیا) اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی مگر اس خیال سے کہ بیگم صاحب برا نہ مانیں روپیہ لیے لیتی ہوں۔ اچھا اب یہ کہیے کہ مکان کہاں ہے؟

بڑی بی :۔ مکان تو ذرا دور ہے، نواب گنج میں ہے۔ یہ لڑکا شام کو آئے گا، اسی کے ساتھ چلی آنا مگر اتنا خیال رہے کہ کوئی مرد ذات تمھارے ملنے والوں میں سے تمھارے ساتھ نہ ہو۔

میں :۔ اور سازندے؟

بڑی بی :۔ سازندے، خدمت گار، ان کی منا ہی نہیں ہے۔ کوئی اور نہ ہو۔

میں :۔ جی نہیں۔ یہاں میرا کون ایسا ملاقاتی ہے جسے ساتھ لاؤں گی۔ خاطر جمع رکھیے۔

اتنے میں خدمت گار نے حقہ تیار کیا۔ میں نے اشارہ کیا۔ بڑی بی کے سامنے لگا دو۔ بڑی بی مزے لے لے کے حقہ پینے لگیں۔ میں ایک پان پر کتھا چونا لگا کے ڈلیوں کا چورا ڈبیہ میں پڑا ہوا تھا ایک چٹکی اس کی اور الائچی کے دانے پاندان کے ڈھکنوں پر کچل کے گلوری بنا کے بڑی بی کو دینے لگی۔

بڑی بی:۔ ہائے بیٹا دانت کہاں سے لاؤں جو پان کھاؤں۔

میں:۔ آپ کھائیے تو میں نے آپ ہی کے لائق پان بنایا ہے۔

بڑی بی بیٹھ گئیں۔ پان لے کے کھایا۔ بہت ہی خوش ہوئیں۔ ہائے ہمارے شہر کی تمیز داری۔ اتنا کہہ کے دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہوئیں۔ چلتے چلتے کہہ گئیں ذرا دن سے آجانا۔ گھڑی بھر دن رہے گرہ لگائی جائے گی۔

میں:۔ اگرچہ مجرے کا دستور نہیں ہے مگر خیر بیگم صاحب نے یاد کیا ہے تو میں سویرے سے حاضر ہو کر مبارک باد گاؤں گی۔

واقعی وطن کی قدر باہر جا کے ہوتی ہے۔ کان پور میں سیکڑوں جگہ مجرے ہوئے مگر کہیں جانے کا ایسا اشتیاق ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ جلدی سے شام ہو جائے اور میں روانہ ہوؤں۔ گرمیوں کا دن پہاڑ ہوتا ہے۔ خدا خدا کر کے اتنا دن کٹا۔ پانچ بجتے بجتے لڑکا آموجود ہوا۔ میں پہلے ہی سے بنی ٹھنی بیٹھی تھی۔ سازندوں کو بلوا رکھا تھا۔ لڑکے نے ان کے مکان کا پتہ بتا دیا۔ میں سوار ہو کے روانہ ہو گئی۔

بیگم کا مکان شہر سے کوئی گھنٹہ بھر کا راستہ تھا ۶ بجے میں وہاں پہنچی۔ نہر کے کنارے ایک باغ تھا جس کے چاروں طرف مینڈ پر ناگ پھنی اور دوسرے خاردار درخت اس طرح برابر بٹھائے گئے تھے جس سے دیوار سی بن گئی تھی۔ باغ کی قطع بالکل انگریزی تھی۔ تاڑ، کھجور اور طرح طرح کے خوب صورت درخت قرینے سے لگائے گئے تھے، روشوں پر سرخی کٹی ہوئی تھی، چاروں طرف سبزہ تھا، جا بجا کنکروں کی پہاڑیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ ان پر انواع اقسام کے پہاڑی درخت پتھروں کے اندر سے اُگے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ پہاڑیوں کے گرداگرد دوب

جمائی گئی تھی۔ باغ میں ہر چہار طرف پکّے برہے بنے ہوئے تھے، ان میں صاف موتی سا پانی بہہ رہا تھا۔ مالی نلوں اور فواروں کے ذریعہ سے پانی دے رہے تھے پتیوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ دن بھر کی دھوپ کھائے ہوئے پھولوں میں، جو اب پانی پہنچا تھا، کیسے تر و تازہ اور شاداب تھے۔ سال گرہ کی رسم کوٹھی میں ادا ہوئی تھی عورتوں کے گانے کی آواز آئی۔ باہر میں نے مبارک باد گائی۔ پھر آپ ہی آپ شام کلیان کی ایک چیز شروع کر دی۔ کوئی سننے والا نہ تھا آپ ہی گایا کی پھر چپ ہو رہی بیگم صاحب نے ایک اشرفی اور پانچ روپیہ انعام کے بھیجے۔ تھوڑی دیر میں شام ہو گئی۔ چاند نکل آیا، چاندنی پھیل گئی۔ تالاب کے پانی میں ماہتاب کا عکس موجوں سے ہل کر عجب کیفیت دکھا رہا تھا۔

باغ کے کنارے پر ایک بہت عالی شان کوٹھی تھی۔ وسط باغ میں ایک پختہ تالاب بنا ہوا تھا۔ اس کے گرد ولایتی پھولوں کے ناندے نہایت خوبصورتی سے سجے ہوئے تھے۔ اسی تالاب سے ملا ہوا ایک اونچا چبوترہ تھا۔ اس کے درمیان ایک مختصر سا ہوا دار چوبی بنگلہ تھا۔ اس کے ستونوں پر رنگ آمیزی کی ہوئی تھی، اس تالاب میں نہر سے پانی گرتا تھا۔ پانی کے گرنے کی آواز سے دل میں ٹھنڈک پہنچتی تھی۔ واقعی عجیب عالم تھا۔ شام کا سہانا وقت، ستھری ہوا، رنگ رنگ کے پھولوں میں مہک، ایسی فضا میں نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ چبوترے پر سفید چاندنی کا فرش تھا، مسند تکیہ لگا ہوا تھا۔ اسی کے سامنے ہم لوگ بٹھائے گئے۔ کوٹھی سے لے کر اس چبوترے تک گلاب کی بیلوں سے ایک چھتا سا بنا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اسی کی راہ سے بیگم صاحبہ تشریف لاتی ہیں۔ سامنے چلمنیں پڑی ہوئی تھیں۔ چبوترے پر سبز مردنگیں روشن ہو گئیں۔ مجھے گانے کا حکم ہوا۔ میں نے کدارے کی ایک چیز شروع کر دی۔ بڑی دیر تک گایا کی۔ اتنے میں ایک مہری ہاتھوں میں دو سبز کنول لیے باہر نکلی۔ مسند کے سامنے رکھ دیے۔ سازندوں سے کہا "تم لوگ وہ سامنے شاگرد پیشہ میں چلے جاؤ کھانا بھیج دیا جائے گا۔ اب یہاں زنانہ ہوگا۔"

جب وہ لوگ اٹھ گئے، بیگم صاحب برآمد ہوئیں۔ میں تعظیم کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ انھوں نے مجھ کو قریب بلایا، خود مسند پر بیٹھ گئیں۔ مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں تسلیم کر کے بیٹھ گئی۔ گانے کے لیے حکم کی منتظر تھی اور بیگم کی صورت غور سے دیکھ رہی تھی ؎

حیرانی نگاہ تماشا کرے کوئی　　صورت وہ روبرو ہے کہ دیکھا کرے کوئی

پہلے تو وہ باغ اور وہاں کی فضا دیکھ کے مجھے پرستان کا شبہ ہوا تھا مگر اب یقین ہو گیا کہ پری میرے سامنے گاؤ سے لگی بیٹھی ہے، مانگ نکلی ہوئی ہے چوٹی کمر تک پڑی ہوئی، سرخ و سفید رنگت، اونچا ماتھا، کھنچی ہوئی بھنویں، بڑی بڑی آنکھیں جیسے گلاب کی پتیاں، لچھوئی ناک، چھوٹا سا دہانہ، پتلے پتلے نازک ہونٹ، نقشے بھر میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے بہتر میرے خیال میں کوئی چیز آسکتی ہو۔ اس پر اعضا کا تناسب اور ابھراپن کس قدر خوش نما تھا۔ سیکڑوں عورتیں میری نظر سے گزر گئیں مگر میں نے اس بلا کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ خورشید سے بہت جھلک ملتی تھی مگر کہاں خورشید کہاں وہ۔ خورشید کی صورت میں پھر ڈومنی پنا تھا اس میں یہ امیرانہ رعب، یہ تمکنت، یہ بھاری بھرکم پن کہاں۔ دوسرے خورشید ان کے سامنے کسی قدر بھدی معلوم ہوتی تھی۔ ان کا کامنی سا نازک نازک چھریرا بدن اس نے کہاں پایا۔ دوسرے اس کی صورت پر آٹھ پہر اداسی برستی تھی۔ جب دیکھو بروگن بنی تھی۔ بیگم صاحبہ بہت ہی خوش مزاج معلوم ہوتی ہیں۔ بات کرتی ہیں گویا منھ سے پھول جھڑتے ہیں۔ ہر بات پر خود بخود ہنسے دیتی ہیں مگر کسی کو مجالِ کلام نہیں۔ واقعی سادگی میں تکلف اور تمکنت کے ساتھ شوخی انھیں میں دیکھی۔ دولت مندوں کی خوشامد سب کرتے ہیں مگر میں عورت ذات ہو کے کہتی ہوں کہ رئیسوں کی خوشامد بھی اگر بے غرض کی جائے تو کوئی عیب نہیں۔ لباس اور زیور بھی اسی صورت کے لائق تھا۔ مہین بسنتی دوپٹہ کندھوں سے ڈھلکا ہوا، کیچلی کا سلوکہ پھنسا پھنسا۔ سرخ گرنٹے کا پاجامہ، کانوں میں صرف یاقوت

کے آویزے، ناک میں ہیرے کی کیل، گلے میں سونے کا سادہ طوق ہاتھ میں سونے کی سمرنیں، بازوؤں پر نورتن، پاؤں میں سونے کی بیڑیاں، چہرے کی خوب صورتی، لباس کی سادگی اور زیور کی مناسبت یہ سب چیزیں میری آنکھوں کے سامنے تھیں اور میں نقشِ حیرت بنی بیٹھی تھی۔ بغور صورت دیکھ رہی تھی اور میری صورت تو جیسی کچھ ہے وہ اس وقت آپ کے سامنے ہے۔ مگر یقین کیجیے گا ان کی توجہ بھی کسی اور طرف نہ تھی مجھی کو دیکھ رہی تھیں۔ دونوں طرف سے نگاہیں لڑی ہوئی تھیں میرے دل میں بار بار ایک خیال آتا تھا مگر اس کے اظہار کا موقع نہ تھا۔ کہوں تو کیوں کر کہوں۔ ایک مہری پس پشت کھڑی پنکھا جھل رہی تھی، دو سامنے کھڑی تھیں، ایک کے ہاتھ میں چاندی کی لوٹیا تھی دوسری کے پاس خاصدان۔ بڑی دیر تک نہ بیگم صاحبہ نے مجھ سے بات چیت کی اور نہ میں کچھ بول سکی۔ آخر انھوں نے سلسلۂ کلام اس طرح شروع کیا۔

بیگم:۔ تمھارا کیا نام ہے؟

میں:۔ (ہاتھ باندھ کے) امراؤ جان

بیگم:۔ خاص لکھنؤ میں مکان ہے؟

میں:۔ (یہ سوال کچھ اس رخ سے کیا گیا تھا کہ مجھے جواب دینا مشکل ہوا خصوصاً اس موقعہ پر اس لیے کہ اگر کہتی ہوں کہ لکھنؤ میں میرا مکان ہے تو ایک مطلب جو میرے دل میں تھا فوت ہو جاتا ہے۔ فیض آباد بتاتی ہوں تو بے محل افشائے راز کا خیال ہے۔ آخر بہت سوچ سمجھ کے) جی ہاں پرورش تو لکھنؤ میں پائی ہے۔ جواب دینے کو تو دے دیا مگر اس کے ساتھ ہی خیال ہوا کہ اب جو سوال کیا جائے گا تو پھر وہی دقت پیش آئے گی۔ میرا خیال غلط نہ تھا اس لیے کہ فوراً بیگم صاحبہ نے پوچھا

بیگم:۔ تو کیا پیدائش لکھنؤ کی نہیں ہے؟

میں:۔ اب حیران ہوں کہ کیا جواب دوں۔ تھوڑی دیر سکوت کیا جیسے کچھ سنا

ہی نہ تھا (آخر اس بات کو ٹال کے، حضور کا دولت خانہ لکھنؤ میں ہے؟

بیگم :۔ کبھی لکھنؤ میں تھا۔ اب تو کانپور وطن ہو گیا۔

میں :۔ میرا بھی یہی ارادہ ہے۔

بیگم :۔ کیوں؟

میں :۔ (اس سوال کا جواب دینا بھی دشوار تھا۔ کون قصہ بیان کرتا) اب کیا عرض کروں، بے کار سمع خراشی ہوگی۔ حال ناگفتہ بہ ہے۔ کچھ ایسے ہی اتفاقات پیش آئے۔ لکھنؤ جانے کو جی نہیں چاہتا۔

بیگم :۔ چلو اچھا ہے تو ہمارے پاس بھی کبھی کبھی چلی آیا کرو۔

میں :۔ آنا کیسا، میرا تو ابھی سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ اوّل تو آپ کی قدردانی، دوسرے یہ باغ یہ فضا۔ ممکن ہے کہ کوئی ایک بار دیکھے اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس نہ ہو۔ خصوصاً ایسی خفقانی مزاج کی عورت کے لیے تو یہاں کی آب و ہوا اکسیر کا خواص رکھتی ہے۔

بیگم :۔ اے ہے! تمھیں یہ جنگل بہت پسند آیا، نہ آدمی نہ آدم ذات ہیہات خدا کی ذات۔ شہر سے کوسوں دور، چار پیسے کا سودا منگاؤ تو آدمی صبح کا گیا ہوا شام کو آتا ہے چھائیں پوئیں شیطان کے کان بہرے کوئی بیمار ہو تو جب تک حکیم شہر سے آئیں آئیں یہاں آدمی کا کام تمام ہو جائے۔

میں :۔ حضور اپنی اپنی طبیعت۔ مجھے تو بہت پسند ہے، میں تو جانتی ہوں کہ اگر یہاں رہوں تو مجھے یہاں کسی چیز کی ضرورت ہی نہ ہو۔ دوسرے ایسے مقام پر بیمار ہونا کیا ضرور ہے۔

بیگم :۔ جب میں پہلے پہل آئی تھی تو میرا بھی یہی خیال تھا۔ کچھ دنوں یہاں رہ کے معلوم ہوا کہ شہر کے رہنے والے ایسے مقام پر نہیں رہ سکتے شہر میں ہزار طرح کا آرام ہے اور سب باتوں کو جانے دو۔ جب سے نواب کلکتہ گئے ہیں راتوں کو ڈر کے مارے نیند نہیں آتی۔ یوں تو خدا کے دیے سپاہی،

پاسی، خدمت گار۔ اس وقت بھی دس بارہ مرد نوکر ہیں عورتوں کی گنتی نہیں مگر پھر بھی ڈر لگتا ہے۔ میں دو چار دن اور راہ دیکھتی ہوں اگر نواب جمی جم آئے تو میں شہر میں کوئی مکان لے کے جا رہوں گی۔

میں:۔ قصور معاف۔ آپ کا مزاج وہمی ہے، ایسے ایسے وسواس دل میں نہ لایا کیجیے۔ شہر میں جائیے گا تو قدر عافیت کھلے گی، وہ گرمی ہے کہ آدمی پکے جاتے ہیں۔ دوسرے بیماریاں کہ خدا پناہ میں رکھے۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں کھلائی بچے کو لے کے آئی۔ تین برس کا لڑکا تھا، ماشاء اللہ گورا گورا، خوب صورت، ایسی پیاری پیاری باتیں کرتا تھا جیسے مینا۔ بیگم نے کھلائی سے لے کے گود میں بٹھا لیا۔ تھوڑی دیر کھلا کودا کے پھر کھلائی کو دینے لگیں کہ میں نے ہاتھ بڑھا کے لے لیا۔ بڑی دیر تک لیے رہی اور پیار کیا کی پھر کھلائی کو دے دیا۔

میں:۔ یوں تو شاید نہ آتی مگر میاں کو دیکھنے تو ضرور ہی آؤں گی۔

بیگم:۔ (مسکرا کے) اچھا کسی طرح ہو آنا ضرور

میں:۔ ضرور حاضر ہوں گی۔ یہ آپ کیوں بار بار فرماتی ہیں۔ میں تو اس قدر حاضر ہوں گی کہ حضور کو دوبھر ہو جاؤں گی۔

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ بیگم نے میرے گانے کی بہت تعریف کی، اسی اثنا میں خاصہ والی نے آ کے کہا کہ خاصہ تیار ہے۔ بیگم نے کہا چلو کھانا کھا لو۔

میں:۔ بہت خوب۔

بیگم مسند سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں بھی ساتھ ہی اٹھی۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا مہریوں کو اشارہ کیا، تم یہیں ٹھہرو، ہم کھانا کھا کے یہیں بیٹھیں گے۔

میں:۔ واقعی اس وقت کا سماں تو ایسا ہے کہ جانے کو جی نہیں چاہتا مگر حکم حاکم۔

بیگم:۔ تو کیا کھانا یہیں منگوا لیا جائے؟

میں :۔ جی نہیں۔ اچھا کھانا کھا کے چلے آئیں گے۔
بیگم :۔ (ایک مہری سے) اِن کے ساتھ کے آدمیوں کو کھانا دلوا دیا گیا؟
مہری :۔ (ہاتھ باندھ کے) حضور دلوا دیا گیا۔
بیگم :۔ اچھا انھیں رخصت کرو۔ ہم نے دوسرا مجرا معاف کیا۔ امراؤ جان کھانا کھا کے جا دیں گی۔

اس کے بعد بیگم اور ہم دونوں کوٹھی کی طرف چلے۔ ایک مہری آگے آگے فانوس لیے جاتی تھی۔ چپکے سے میرے کان میں کہا، مجھ کو تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں مگر آج اس کا موقع نہیں۔ کل تو مجھے فرصت نہیں پرسوں تم صبح آنا اور کھانا یہیں کھانا۔

میں :۔ مجھے بھی کچھ عرض کرنا ہے۔
بیگم :۔ اچھا تو آج کچھ نہ کہو۔ چلو کھانا کھا لیں اس کے بعد تمھارا گانا سنیں گے۔
میں :۔ پھر سازندوں کو تو حضور نے رخصت کر دیا۔
بیگم :۔ ہم کو مردوں کے ساتھ گانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میری ایک خواص خوب طبلہ بجاتی ہے اس پر گانا۔
میں :۔ بہت خوب!

اب ہم کوٹھی کے پاس پہنچ گئے۔ بہت وسیع کوٹھی تھی اور اس طریقے سے سجی ہوئی تھی کہ شاہی کوٹھیوں کو دیکھنے کے بعد اگر کوئی کوٹھی دیکھی تو یہی دیکھی۔ پہلے برآمدہ ملا اس کے بعد کئی کمروں سے ہو کے گزرے۔ ہر ایک نئے طرز سے سجا ہوا تھا ہر کمرے کا فرش فروش اور شیشہ آلات ایک نئے رنگ اور نئے طرز کا تھا۔ آخر ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں دسترخوان چنا ہوا تھا۔ دسترخوان پر دو عورتیں اور منتظر تھیں۔ ان میں سے ایک چٹھی نویس تھی، ایک مصاحب۔ ان دونوں کا لباس بھی بہت زرق برق تھا۔ صورتیں بھی اچھی تھیں۔

دسترخوان پر کئی قسم کے کھانے پلاؤ، بورانی، مزعفر، متنجن، سفیدہ، شیرمال

باقرخانیاں، کئی طرح کے سالن، کباب، اچار، مربے، مٹھائیاں، دہی، بالائی غرض کہ ہر قسم کی نعمت موجود تھی۔ لکھنؤ سے نکلنے کے بعد آج کھانے کا مزہ آیا۔ بیگم ہر طرح کی چیزیں میرے سامنے رکھتی جاتی تھیں۔ میں اگرچہ کسی قدر تکلف سے کھانا کھاتی تھی مگر ان کے اصرار نے ضرورت سے زیادہ کھلا دیا۔

بیسن دانی اور تسلہ آیا۔ ہاتھ منھ دھو کے سب نے پان کھائے پھر اسی چبوترے پر جلسہ جما۔ اس جلسہ میں صرف بیگم صاحبہ نہ تھیں، چٹھی نویس، مصاحبین، مغلانیاں، پیش خدمتیں، مہریاں، مامائیں، سب ملا کے کوئی دس بارہ عورتیں تھیں۔

بیگم صاحبہ نے حکم دیا کہ طبلہ کی جوڑی اور ستار اٹھا لاؤ۔ ایک مصاحب جو طبلہ بجانے میں مشاق تھی، طبلہ بجانے لگی۔ خود بیگم صاحبہ ستار چھیڑنے لگیں، مجھے گانے کا حکم دیا۔

کھاتے کھلاتے دس گیارہ بج چکے تھے، جب ہم گانے کو بیٹھے ہیں ٹھیک بارہ بجے کا وقت تھا۔ اس وقت وہ باغ جس میں بہت سا روپیہ صرف کر کے جنگل اور پہاڑ کی گھاٹیوں کے نمونے بنائے گئے تھے عجب وحشت ناک سماں دکھا رہا تھا۔ ایک طرف چاند اس عالی شان کوٹھی کے ایک گوشہ سے تھوڑی دور پر گنجان درختوں کی شاخوں سے نظر آتا تھا مگر اب ڈوبنے ہی کو تھا۔ تاریکی روشنی پر چھائی جاتی تھی جس سے ہر چیز بھیانک معلوم ہونے لگی۔ درخت جتنے اونچے تھے اس سے کہیں بڑے نظر آتے تھے۔ ہوا سن سن چل رہی تھی، سرو کے درخت سائیں سائیں کر رہے تھے اور تو ہر طرف خموشی کا عالم تھا مگر تالاب میں پانی گرنے کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی کوئی پرندہ اپنے آشیانے میں چونک کر ایک ہانک بول دیتا تھا۔ یا شکاری جانوروں کے ہول سے جو چڑیاں اڑتی تھیں اس سے پتے کھڑک جاتے تھے یا کبھی کوئی مچھلی تالاب میں اچھل پڑتی تھی۔ مینڈک اپنا بے تکا راگ گا رہے تھے، جھینگر آس دے رہے تھے۔ سوائے اس چبوترے کے جہاں دس بارہ جوان جوان عورتیں رنگ رنگ کا لباس پہنے اور طرح طرح کے زیور سے

آراستہ جلسہ جمائے بیٹھی تھیں اور کوئی آس پاس نہ تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے کنول بجھ گئے تھے۔ صرف دو مردنگوں کی روشنی تھی۔ ان کے بھی شیشے سبز۔ یا تاروں کا عکس جو تالاب کے پانی میں ہلکورے لے رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا، طلسمات کا عالم تھا، وقت اور مقام کی مناسبت سے میں نے سوہنی کی ایک چیز شروع کر دی۔ اس راگنی کے بھیانک سروں نے دلوں پر اپنا پورا اثر کیا تھا، سب مبہوت بیٹھے تھے۔

مارے خوف کے باغ کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ خصوصاً گنجان درختوں کے نیچے اندھیرا گھپ تھا۔ سب ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے۔ گویا وہ جلسہ امن کی جگہ تھی اور جدھر نگاہ اٹھا کے دیکھو ایک ہو کا عالم تھا۔ اوروں کا کیا ذکر خود میرا کلیجہ دھڑک رہا تھا۔ دل ہی دل میں کہتی تھی بیگم نے سچ کہا تھا بے شک یہ جگہ رہنے کے لائق نہیں ہے۔ اس اثنا میں گیدڑ کے بولنے کی آواز آئی۔ اس نے اور بھی دلوں کو ہلا دیا۔ اس کے بعد کتے بھونکنے لگے۔ اب تو مارے دہشت کے یہ حال تھا کہ کسی کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ اتنے میں بیگم نے گاؤ تکیہ سے ذرا اونچی ہو کے اپنے سامنے کچھ دیکھا اور زور سے ایک چیخ مار کے مسند پر گر پڑیں اور سب عورتیں بھی اسی طرف دیکھنے لگیں، میں بھی مڑ کے دیکھنے لگی۔

میں بیگم صاحب کو سمجھ چکی تھی کہ وہمی ہیں مگر اب جو دیکھتی ہوں تو ان کے وہم کی حقیقت نظر آنے لگی۔ سامنے سے دس پندرہ آدمی منھ پر ڈھانٹے باندھے، ننگی تلواریں ہاتھ میں، دوڑتے چلے آتے ہیں۔ عورتوں کے چلانے سے بیگم کے نوکر چاکر، خدمت گار، پاسی سب اسی طرف چلے۔ کوئی نہتا کسی کے ہاتھ میں لاٹھی، مگر ڈاکو زیادہ تھے اور یہاں آدمی کم تھے، کئی تو راستے سے فرار ہو گئے۔ پانچ چار آدمی چبوترے تک پہنچ ہی گئے۔ انھوں نے آکر عورتوں کو بیچ میں کر لیا اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو کے کھڑے ہو گئے۔ عورتوں میں سے کسی کو ہوش نہ تھا۔ سب غش کی حالت میں بے دم پڑی تھیں۔ ایک میں خدا جانے کیا پتھر کا دل تھا کہ بیٹھی

رہی۔ مارے ہول کے دم نکلا جاتا تھا۔ یا اللہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

بیگم کے آدمیوں میں سے جن کے پاس حربے تھے وہ آگے بڑھنے ہی کو تھے کہ سرفراز نامی ایک سپاہی نے روکا۔

سرفراز:۔ (اپنے ساتھیوں سے) ٹھہرو ابھی جلدی نہ کرو۔ پہلے ہمیں ان لوگوں کا عندیہ معلوم کر لینے دو (ڈاکوؤں سے) تم لوگ کس ارادے سے آئے ہو؟

ایک ڈاکو:۔ جس ارادے سے آئے ہیں تمھیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔

سرفراز:۔ وہی میں پوچھتا ہوں۔ جان کے خواہاں ہو یا مال کے؟

دوسرا ڈاکو:۔ ہمیں جان سے کوئی غرض نہیں، کوئی باپ مارے کا بیر ہے۔ ہاں جس ارادے سے آئے ہیں اُس میں تم مزاحم ہوگے تو دیکھا جائے گا۔

سرفراز:۔ (کسی قدر سخت ہو کے) تو کیا بہو بیٹیوں کی آبرو لوگے، اگر یہ مقصد ہو۔

..... سرفراز پوری بات بھی ختم نہ کرنے پایا تھا کسی نے ڈاکوؤں کی طرف سے کہا۔

کوئی ڈاکو:۔ نا صاحب کسی کی بہو بیٹیوں سے کیا واسطہ، کیا ہمارے بہو بیٹیاں نہیں ہیں۔ عورتوں کے کوئی ہاتھ لگا سکتا ہے۔ اس آواز پر مجھے کچھ شبہہ سا ہوا۔

سرفراز:۔ (خوش ہو کے) تو پھر یہی تو میں پوچھتا ہوں، اچھا تو بھائیو ہم ابھی تمھیں کوٹھی کے کمروں کی کنجیاں منگائے دیتے ہیں اور جو عورتیں وہاں ہیں ان کو یہاں بلوائے لیتے ہیں۔ گھر کی مالک بیگم یہیں ہیں۔ تم شوق سے کوٹھی میں جاؤ جو جی چاہے اٹھا لے جاؤ۔ رہا عورتوں کا زیور وہ بھی اتروائے دیتے ہیں۔ ہمارا مالک کچھ اس سے غریب نہ ہو جائے گا۔ خدا کے حکم سے لاکھوں روپیہ بنک گھر میں جمع ہے۔ علاقہ سے جو روپیہ آتا ہے اس کا ذکر نہیں۔

ڈاکو:۔ اس سے بہتر کیا ہے مگر دیکھو اس میں دغا نہ ہو۔

سرفراز:۔ سپاہی کے پوت دغا نہیں دیتے۔ خاطر جمع رکھو۔

وہی ڈاکو جس کی آواز میں نے پہچانی تھی آگے بڑھا "واہ کیا کہنا مردوں کا قول ہی تو ہے۔ اچھا کنجیاں؟"

اتنا کہنا تھا کہ میرے اس کے نگاہیں چار ہوئیں۔ میں نے تو پہچان لیا بولنے کا قصد کیا مگر دل میں ایسی دہشت سمائی ہوئی تھی کہ منھ سے آواز نہ نکلتی تھی کہ اتنے میں خود اس نے آگے بڑھ کے کہا۔

"بھابھی تم یہاں کہاں؟"

میں:۔ جب سے تمھارے بھائی قید ہو گئے یہیں ہوں۔

فضل علی:۔ یہاں کس کے پاس؟

میں:۔ رہتی تو شہر میں ہوں مگر یہاں میری ایک بہن بیگم صاحب کے پاس نوکر ہیں ان سے ملنے آئی تھی۔

فضل علی:۔ تمھاری بہن کہاں ہیں؟

میں:۔ یہیں ہیں۔ جب سے تم لوگوں کے آنے کا ہنگامہ ہوا، بے چاری غش میں پڑی ہیں۔ میری طرح تو ہیں نہیں، بے چاری پردہ نشین ہیں۔ جوانی میں رانڈ ہوئی جب سے امیر رئیسوں کی نوکریاں کرتی پھرتی ہیں۔

فضل علی:۔ (اپنے ساتھیوں سے) یہاں سے ایک پیسہ کی چیز لینا تو میرے نزدیک حرام ہے اور نہ اس معاملہ میں میں تمھارے ساتھ ہوں۔

ایک ڈاکو:۔ یہ کیا۔ پھر آئے کیوں تھے۔

فضل علی:۔ جس ارادے سے آئے تھے تمھیں معلوم ہے مگر کسی کا کچھ خیال بھی ہے مجھ سے تو نہیں ہو سکتا کہ فیضو بھائی کی آشنا اور اس کی بہن کا اسباب لوٹوں یا جس سرکار سے ان لوگوں کا توسل ہو وہاں دست درازی کروں۔ اگر وہ قید میں سنے گا تو کیا کہے گا۔

اس بات پر ڈاکوؤں کے آپس میں بہت جھگڑا ہونے لگا مگر سب فضل علی کا دباؤ مانتے تھے۔ کوئی دم نہ مار سکتا تھا پھر بھی خالی ہاتھ پھر جانا کچھ ایسی سہل بات نہ تھی۔ سب ڈاکو غل مچاتے تھے۔ فاقوں مرتے ہیں ایک موقع ملا بھی تو اسے خاں صاحب چھوڑے دیتے ہیں۔ آخر پیٹ کہاں سے پالیں۔

جب فضل علی اپنے گروہ سے نکل کے الگ کھڑے ہوئے تو اُن کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور سیاہ فام شخص یہ کہتا ہوا نکلا۔

وہ شخص:۔ کھاں صاحب میں بھی تمرے ساتھ ہوں۔

غور سے جو دیکھتی ہوں، معلوم ہوا کہ فیض علی کا سائیس ہے۔ میں نے اُسے بلایا۔ علیٰحدہ لے جا کے باتیں کیں۔ وہ اشرفی اور روپیہ جو بیگم صاحبہ نے انعام دیے تھے چپکے سے اسے دے دیے۔

فضل علی:۔ (سرفراز خاں سے) بھائی میں تمھارے ساتھ ہوں، اب تم جانو اور یہ لوگ۔

سرفراز:۔ میں ان لوگوں کو ابھی راضی کیے دیتا ہوں مگر یہاں سے چلو۔ عورتیں پریشان ہو رہی ہیں، سرکار عش میں پڑی ہیں۔ ذرا ان کو ہوش میں آنے دو، ہم تم لوگوں کو خوش کر دیں گے۔

ڈاکو وہاں سے چلے گئے۔ بیگم صاحبہ ابھی تک بے ہوش پڑی تھیں۔ دانت بیٹھ گئے۔ میں تالاب سے ہاتھ میں پانی لائی۔ ان کے منھ پر چھینٹے دیے۔ بڑی مشکل سے ہوش میں آئیں۔ میں نے کہا سنبھل کے بیٹھیے۔ خدا کے صدقہ سے وہ آفت ٹل گئی۔ خاطر جمع رکھیے۔ اور عورتوں کو بھی پانی چھڑک کے اٹھایا۔ سب اٹھ اٹھ کے بیٹھیں۔ جب اطمینان ہو گیا تو میں نے کل واقعہ بیان کیا۔ بیگم صاحبہ بہت خوش ہوئیں۔ سرفراز خاں کو بلا بھیجا۔

سرفراز:۔ سرکار کچھ دے دیجیے بغیر اس کے کام نہ چلے گا۔ اس وقت نامراد جان یہاں ہوتیں نہ یہ آفت ٹلتی:۔

میں:۔ (میں نے اس بات کا جواب کچھ نہ دیا اس لیے کہ میں سمجھ گئی کہ اس وقت میں یہ راز کی بات ان کے منھ سے نکل گئی ہے اس موقع پر ایسی باتوں کا اظہار ان کی شان کے خلاف ہے) جی نہیں! میں نے کیا کیا، یہ بھی اتفاق تھا۔

مختصر یہ کہ بیگم نے صندوقچہ منگایا۔ پانچ سو نقد اور پانچ سو کا سونے چاندی کا زیور دے کے انھیں ٹالا۔ سب کی جان میں جان آئی۔ بیگم کا اس وقت کا کہنا مجھے آج تک یاد ہے۔

بیگم:۔ کیوں امراد جان باغ میں رہنے کا مزہ دیکھا؟

میں:۔ حضور سچ کہتی تھیں۔

اب صبح کے تین بج گئے تھے۔ سب لوگ اٹھ اٹھ کے کوٹھی میں گئے۔ ان لوگوں کے ساتھ میں بھی اٹھی۔ کوٹھی کے برآمدے میں ایک پلنگ میرے لیے بچھوا دیا گیا۔ نیند کسے آتی ہے۔ رات بھر جاگ رہی۔ صبح ہوتے سب سو گئے میری آنکھ بھی لگ گئی۔ ابھی نیند بھر کے سونے نہ پائی تھی کہ میرے خدمت گار سواری لے کے آگئے۔ مجھے جگوایا۔ میں آنکھیں ملتی ہوئی باہر گئی۔

خدمت گار:۔ آپ تو خوب یہاں آئیں۔ رات بھر ہم لوگ راہ دیکھا کیے۔

میں:۔ کیوں کر آتی۔ سواری کو تو رخصت کر دیا تھا۔

خدمت گار:۔ اچھا تو اب چلیے، لکھنؤ سے لوگ آپ کے پاس آتے ہیں۔

میں سمجھ گئی، ہوں نہ ہوں بوا حسینی اور گوہر مرزا ہوں گے۔ آخر پتہ لگا لیا نہ؟

میں:۔ اچھا چلتی ہوں سواری لائے ہو؟

خدمت گار:۔ حاضر ہے۔

جب میں نے جانے کا قصد کیا۔ دو ایک عورتیں اور جاگ چکی تھیں۔ مجھ کو روکا کہ بیگم صاحبہ سے مل کے جائیے گا۔ میں نے کہا اس وقت کام ہے۔ بیگم صاحبہ خدا جانے کب سو کے اٹھیں گی۔ ایسا ہی ہے تو پھر آؤں گی۔

گھر پر جو آ کے دیکھتی ہوں بوا حسینی اور میاں گوہر مرزا بیٹھے ہوئے ہیں۔ بوا حسینی میرے گلے سے لپٹ گئیں، رونے لگیں۔ میں بھی رونے لگی۔

بوا حسینی:۔ اللہ بیٹی کیا سخت دل کر لیا۔ تمھیں کسی کی محبت ہی نہیں۔

میں بجائے خود شرمندہ تھی۔ جواب کیا دیتی جھوٹ موٹ رونے لگی۔

معمولی گفتگو کے بعد بوا حسینی نے اسی دن لکھنؤ چلنے کا ارادہ کر دیا۔ میں نے لاکھ لاکھ اصرار کیا کہ ٹھہر جاؤ۔ انھوں نے نہ مانا۔ زیادہ عجلت کی وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب بیمار تھے، بوا حسینی کو دم بھر کہیں کا ٹھہرنا شاق تھا۔ ایسی ہی میری محبت تھی جو چلی بھی آئی تھیں۔ وہ دن کان پور سے اسباب وغیرہ خریدنے اور مکان کے کرائے اور نوکروں چاکروں کے حساب کرنے میں تمام ہوا۔ پوری شکرم کرایہ پر کر لی تھی۔ ضروری اسباب اس پر لاد لیا اور فضول سامان نوکروں کو دے دیا۔ دوسرے دن لکھنؤ پہنچ گئی۔ پھر وہی آب و دانہ ہے، وہی مکان، وہی کمرہ، وہی آدمی۔

دشتِ جنوں کے سر میں بہلا ہوا تھا دل
زنداں میں لائے پھر مجھے احباب گھیر کے

دیکھیے پہنچے کہاں تک شورشِ دل کا اثر
صرصرِ وحشت کا یہ شعلہ ہے بھڑکایا ہوا

نواب ملکہ کشور کی سرکار میں سوز خوانی کا سلسلہ انتزاعِ سلطنت کے زمانہ تک رہا۔ اسی اثنا میں شہزادے مرزا سکندر حشمت عرف جرنیل صاحب کے مجرائیوں میں میرا بھی اسم ہو گیا تھا۔ جناب عالیہ اور جرنیل صاحب کلکتہ چلے گئے۔ وہ تعلق منقطع ہو گیا۔

جس زمانے میں مرزا برجیس قدر کو مسندِ ریاست پر بٹھایا میں بہ لحاظ قدامت اور اس وجہ سے بھی کہ میرا نام شاہی محلات میں اکثر کی زبان پر تھا، مبارک باد دینے کے لیے طلب ہوئی۔ شہر میں ایک اندھیر تھا۔ آج اس کا گھر لٹا کل وہ گرفتار ہوا، پرسوں اس کے گولی لگی۔ چاروں طرف قیامت کا سامان نظر آتا تھا۔

سید قطب الدین نامی ایک صاحب افسرانِ فوج میں تھے، ان کا تعین درِ دولت پر تھا۔ میرے حال پر بہت عنایت کرتے تھے۔ اس لیے اکثر وہیں رہنا پڑتا تھا۔ مجرے کے لیے بھی وقت بے وقت طلب ہو جاتی تھی۔

اس چند روزہ حکومت کے زمانہ میں برجیس قدر کے گیارہویں سال کی سالگرہ کا جلسہ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ اس جلسہ میں کشمیریوں نے یہ غزل گائی تھی

غیرت مہتاب ہے برجیس قدر
گوہر نایاب ہے برجیس قدر

میں نے ایک غزل اس موقع کے لیے تصنیف کی تھی۔ اس کا مطلع یہ ہے

دل ہزاروں کے تری بھولی ادائیں لیں گی
حسرتیں چاہنے والوں کی بلائیں لیں گی

رسوا:۔ امراؤ جان تم نے مطلع تو قیامت ہی کا کہا ہے اور کوئی شعر یاد ہو تو پڑھو۔

امراؤ:۔ گیارہ شعر کہے تھے مگر آپ کے سر کی قسم سوا اس مطلع کے اور کوئی شعر یاد نہیں۔ وہ زمانہ ایسی آفت کا تھا۔ نگوڑی دن رات جان دھڑکے میں رہتی تھی۔ غزل ایک پرچہ پر لکھ لی تھی۔ جس دن تک بیگم صاحب قیصر باغ سے نکلی ہیں وہ پرچہ میرے پاندان میں تھا۔ پھر جب وہاں سے نکلنا ہوا ہول جول میں پاندان کیسا جوتیاں اور دوپٹے تک چھوٹ گئے۔

رسوا:۔ بھلا کچھ یاد ہے کس دن بیگم صاحب قیصر باغ سے نکلی تھیں؟

امراؤ:۔ دن تو یاد نہیں۔ ہزاری روزے کے دوسرے یا تیسرے دن۔

رسوا:۔ ہاں تمھیں یاد رہا۔ رجب کی انتیسویں تاریخ تھی۔ بھلا فصل کون سی تھی؟

امراؤ:۔ اخیر جاڑے تھے۔ نوروز کے چار پانچ دن باقی رہے ہوں گے۔

رسوا:۔ بالکل درست، مارچ کی سولھویں تاریخ تھی۔ اچھا تم بیگم صاحب کے ساتھ قیصر باغ سے نکلیں۔

امراؤ:۔ جی ہاں! بونڈی تک ہمراہ گئی۔ راستہ میں نمک حرام اور بزدل فسران فوج کے غمزے اور بیگم صاحب کی خوشامد عمر بھر نہ بھولے گی۔ ایک صاحب کہتے ہیں "لو صاحب ان کے راج میں ہم پیدل چلیں"۔ دوسرے صاحب فرماتے ہیں "بھلا کھانے کو انتظام درست ہوتا"۔ تیسرے صاحب افیم کو پیٹ رہے تھے۔ چوتھے اپنی جان کو رو رہے ہیں کہ حقہ وقت پر نہیں ملتا۔ جب بہرائچ سے انگریزی فوج نے بونڈی پر حملہ کیا ہے اس میں سید قطب الدین مارے گئے۔ بیگم صاحب نیپال کی طرف روانہ ہوئیں، میں اپنی جان بچا کے فیض آباد چلی آئی۔

رسوا:۔ سنا ہے بونڈی میں چار دن کے لیے خوب چہل پہل ہو گئی تھی؟

امراؤ:۔ آپ نے سنا ہے میں نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔ لکھنؤ کے بھاگے ہوئے سب وہیں جمع ہو گئے تھے۔ بونڈی کا بازار لکھنؤ کا چوک معلوم ہوتا تھا۔

رسوا:۔ اچھا اس قصہ سے مجھ کو زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ یہ کہیے کہ وہ مال جو آپ نے میاں فیضو سے لیا تھا اس کا کیا حشر ہوا؟

امراؤ:۔ (ایک آہ سرد بھر کے) اے ہے یہ نہ پوچھیے

رسوا:۔ غدر میں سب لٹ گیا؟

امراؤ:۔ غدر میں لٹ جاتا تو اتنا افسوس نہ ہوتا۔

رسوا:۔ پھر کیا ہوا؟

امراؤ:۔ سارا قصہ دہرانا پڑا۔ جس دن شب کو میں فیضو کے ساتھ بھاگنے والی تھی، میں نے کل زیور اور اشرفیاں ایک پٹاری میں بند کیں اوپر سے خوب کپڑا لپیٹ دیا۔

خانم کے مکان کے پچھواڑے ایک میر صاحب رہتے تھے۔ امام باڑے کے کوٹھے کی دیوار پر چڑھ جاؤ تو ان کے مکان کا سامنا ہو جاتا تھا، میں اکثر چارپائی لگا کے اس دیوار پر چڑھ جایا کرتی تھی اور میر صاحب کی

بہن سے باتیں کیا کرتی تھی۔

وہ زیور کی پٹاری میں نے ان کی بہن کے پاس پھینک دی اور ان سے ہاتھ جوڑ کے کہا کہ اس کو حفاظت سے رکھنا۔ انھوں نے فیض آباد سے آنے کے بعد وہ پٹاری اسی طرح گودڑ میں لپٹی ہوئی میرے حوالے کر دی۔ غدر میں تمام دنیا کے گھر لٹے۔ اگر کہہ دیتیں کہ لٹ گئی تو میں ان کا کیا کر لیتی مگر واہ ری بیوی! ایک حبہ تک کا نقصان نہیں ہوا۔ ایسے ہی لوگوں سے زمین و آسمان تھنبا ہوا ہے۔ نہیں تو کب کی قیامت آجاتی۔

رسوا:۔ بھلا کتنے کا مال ہوگا۔

امراؤ:۔ البتہ کوئی دس پندرہ ہزار کا مال تھا۔

رسوا:۔ اور اب کیا ہوا؟

امراؤ:۔ کیا ہوا۔ جس راہ آیا تھا اسی راہ گیا۔

رسوا:۔ مگر لوگ تو مشہور کرتے ہیں کہ تمھارا ایک حبہ بھی غدر میں نہیں لٹا۔ سب مال تمھارے پاس ہے۔

امراؤ:۔ اگر مال ہوتا تو ان حالوں میں رہتی جیسی اب رہتی ہوں۔

رسوا:۔ لوگ کہتے ہیں تم نے اپنا بھگل نکالا ہے اگر نہیں ہے تو خرچ کہاں سے چلتا ہے۔ اب بھی کچھ برے حالوں نہیں رہتیں۔ دو آدمی نوکر ہیں، خوش خوراک اور خوش پوشاک بھی ہو۔

امراؤ:۔ خدا رزاق ہے، جو جس کا خرچ ہے وہ اس کو ضرور ملتا ہے، اس مال کا تو ایک حبہ بھی نہیں رہا۔

رسوا:۔ اچھا تو پھر کیا ہوا؟

امراؤ:۔ اب کیا بتاؤں ایک مہربان .....

رسوا:۔ میں سمجھ گیا یہ گوہر مرزا صاحب کی حرکت ہوگی؟

امراؤ:۔ میں اپنے منھ سے نہیں کہتی، شاید آپ کا قیاس غلط ہو۔

رسوا:۔ بے شک تمھارے عالی ظرف ہونے میں کوئی شبہہ نہیں۔ دیکھیے وہ چین کر رہے ہیں اور تمھیں پوچھتے تک نہیں۔

امراؤ:۔ مرزا صاحب! رنڈی سے رسم رہا رہا نہ رہا۔ اب وہ مجھے کیوں پوچھیں؟

مدّت ہوئی کہ ترک ملاقات ہوگئی

رسوا:۔ اب کبھی تشریف بھی لاتے ہیں؟

امراؤ:۔ وہ کاہے کو تشریف لائیں گے، میں اکثر جایا کرتی ہوں۔ ان کی بیوی سے محبت ہوگئی ہے۔ ابھی چار دن ہوئے لڑکے کی دودھ بڑھائی کی تھی تو بلا بھیجا تھا۔

رسوا:۔ جب بھی کچھ دے ہی آئی ہوں گی؟

امراؤ:۔ جی نہیں! میں کس قابل ہوں جو کسی کو کچھ دوں گی۔

رسوا:۔ تو وہ مال گوہر مرزا صاحب کے کٹے لگا۔

امراؤ:۔ مرزا صاحب مال کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ہاتھوں کا میل ہے۔ فقط بات رہ جاتی ہے۔ اب بھی اپنے پیدا کرنے والے کے قربان جاؤں، کبھی ننگی بھوکی نہیں رہتی۔ آپ ایسے قدردانوں کو خدا سلامت رکھے مجھے کسی بات کی تکلیف نہیں ہے۔

رسوا:۔ اس میں کیا شک ہے۔ وہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔ اب بھی سو سے اچھی ہزار سے اچھی۔ واللہ یہ تمھاری نیت کا ثمرہ ہے۔ خدا نے زیارت سے بھی مشرف کیا۔

امراؤ:۔ جی ہاں! مولا نے سب مرادیں پوری کیں۔ اب یہ تمنا ہے کہ مجھے کربلا پھر بلا بھیجیں۔ میری مٹی عزیز ہو جائے۔ مرزا صاحب میں اس ارادے سے گئی تھی کہ پھر کے نہ آؤں گی مگر خدا جانے کیا ہوا تھا کہ لکھنؤ سر پر سوار ہوگیا مگر اب کی اگر خدا نے چاہا اور جانا ہوگیا تو پھر نہ آؤں گی۔

سن چکے حال تباہی کا مری اور سنو
اب تمھیں کچھ مری تقریر مزا دیتی ہے

بونڈی سے بیگم صاحب اور مرزا برجیس قدر نیپال کو روانہ ہوئے۔ سید قطب الدین لڑائی میں مارے جا چکے تھے۔ میں بہ ہزار مشکل فیض آباد آئی۔ پہلے سرا میں اتری۔ پھر ترپولیے کے پاس ایک کمرہ کرایہ کو لے لیا تھا۔ میراثی رکھ لیے، گانا بجانا شروع کر دیا۔

فیض آباد میں رہتے ہوئے اب مجھے چھ مہینے گزر چکے ہیں۔ وہاں کی آب و ہوا طبیعت کے بہت موافق ہے۔ دل لگا ہوا ہے، آٹھویں دسویں کوئی نہ کوئی مجرا آجاتا ہے۔ اسی پر بسر ہے۔ تمام شہر میں میرے گانے کی دھوم ہے۔ جہاں مجرا ہوتا ہے ہزاروں آدمی ٹوٹ پڑتے ہیں۔ میرے کمرے کے نیچے لوگ تعریفیں کرتے ہوئے نکلتے ہیں۔ میں دل میں خوش ہوتی ہوں۔ کبھی کبھی خواب و خیال کی طرح بچپن کی باتیں یاد آجاتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی دل میں ایک جوش سا پیدا ہوتا ہے مگر انتزاعِ سلطنت، غدر، برجیس قدر یہ سب سانحے آنکھوں کے سامنے گزر چکے ہیں۔ کلیجہ پتھر کا ہو گیا ہے۔ ماں باپ کے تصور کے ساتھ ہی یہ خیال آتا ہے، خدا جانے اب کوئی زندہ بھی ہو یا نہ ہو اور اگر ہو تو ان کو مجھ سے کیا مطلب، وہ اور عالم میں ہوں گے میں اور عالم میں ہوں۔ خون کا جوش سہی مگر کوئی غیرت دار آدمی مجھ سے ملنا گوارا نہ کرے گا۔ اب ان سے ملنے کی کوشش کرنا ان کو رنج دینا ہے۔ گھر کا خیال آتے ہی وہ باتیں یاد آتی تھیں پھر طبیعت اور طرف متوجہ ہو جاتی تھی۔

لکھنؤ کی یاد اکثر ستاتی تھی مگر جب انقلاب کا خیال آتا تھا۔ دل بھر جاتا تھا۔ اب وہاں کون ہے کس کے لیے جاؤں۔ خانم جیتی ہیں تو کیا ہوا۔ ان سے اب کیوں کر بنے گی وہی اگلی حکومت جتائیں گی۔ مجھے اب ان کی قید میں رہنا کسی طرح منظور نہ تھا۔

جو مال میر صاحب کی بہن کے پاس امانت تھا وہ اب کیا ملے گا۔ تمام لکھنؤ لٹ گیا۔ میر صاحب کا گھر بھی لٹ گیا ہوگا، اس کا اب خیال ہی بے کار ہے۔ اگر نہیں لٹا تو ابھی اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میرے ہاتھ گلے جو کچھ موجود ہے وہ کیا کم ہے؟

ایک دن کمرے پر بیٹھی ہوں، ایک صاحب شریفانہ صورت ادھیڑ سے تشریف لائے۔ میں نے پان بنا کے دیا، حقہ بھروا دیا۔ حالات دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ بہو بیگم صاحبہ کے عزیزوں سے ہیں، وثیقہ پاتے ہیں۔ میں نے باتوں باتوں مقبرہ کی روشنی کی تمہید اٹھا کے پرانے ملازموں کا ذکر چھیڑا۔

میں:۔ اگلے نوکروں میں اب کون کون رہ گیا ہے۔

نواب صاحب:۔ اکثر مر گئے۔ نئے نئے نوکر ہیں۔ اب وہ کارخانہ ہی نہیں رہا۔ بالکل نیا انتظام ہے۔

میں:۔ اگلے نوکروں میں ایک بڈھے جمعدار تھے۔

نواب:۔ ہاں تھے۔ تم انھیں کیا جانو؟

میں:۔ غدر سے پہلے میں ایک مرتبہ محرم میں فیض آباد آئی تھی۔ مقبرے پر روشنی دیکھنے گئی تھی انھوں نے میری بڑی خاطر کی تھی۔

نواب:۔ وہی جمعدار ناجن کی ایک لڑکی نکل گئی تھی۔

میں:۔ مجھے کیا معلوم؟ (دل میں) ہائے افسانہ اب تک مشہور ہے۔

نواب:۔ یوں تو کئی جمعدار تھے اور اب بھی ہیں مگر روشنی وغیرہ کا انتظام غدر سے پہلے وہی کرتے تھے۔

میں:۔ ایک لڑکا بھی ان کا تھا؟

نواب:۔ تم نے لڑکے کو کہاں دیکھا؟

میں:۔ اس دن ان کے ساتھ ایسی شکل بھی ملتے کم دیکھی ہے، بن کہے میں پہچان گئی تھی۔

نواب:۔ جمعدار غدر سے پہلے ہی مر گئے، وہی لڑکا ان کی جگہ نوکر ہے۔

اس کے بعد بات کے ٹالنے کے لیے میں نے اور کچھ حالات اِدھر اُدھر کے پوچھے۔ نواب صاحب نے سوز پڑھنے کی فرمائش کی۔ میں نے دو سوز سنائے۔ بہت محظوظ ہوئے۔ رات کچھ زیادہ آگئی تھی، گھر تشریف لے گئے۔

باپ کے مرنے کا حال سن کے مجھے بہت رنج ہوا۔ اس دن رات بھر رویا کی۔ دوسرے دن بے اختیار جی چاہا بھائی کو جا کے دیکھ آؤں۔ دو دن کے بعد ایک مجرا آگیا، اس کی تیاری کرنے لگی۔ جہاں کا مجرا آیا تھا وہاں گئی۔ محلے کا نام یاد نہیں۔ مکان کے پاس ایک بہت بڑا پرانا املی کا درخت تھا اسی کے نیچے نمگیرا تانا گیا تھا۔ گرد قناتیں تھیں۔ بہت بڑا مجمع مگر لوگ کچھ ایسے ہی ویسے تھے۔ قناتوں کے پیچھے اور سامنے کھپریلوں میں عورتیں تھیں۔ پہلا مجرا کوئی نو بجے شروع ہوا۔ بارہ بجے تک رہا۔ اس مقام کو دیکھ کے وحشت سی ہوتی تھی۔ دل اُمڈا چلا آتا تھا کہ یہیں میرا مکان ہے۔ یہ املی کا درخت وہی ہے جس کے نیچے میں کھیلا کرتی تھی۔ جو لوگ محفل میں شریک تھے ان میں سے بعض ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے میں نے ان کو کہیں دیکھا ہے۔ شبہ مٹانے کے لیے میں قناتوں کے باہر نکلی۔ گھروں کی قطع کچھ اور ہی ہوگئی تھی۔ اس سے خیال ہوا شاید یہ وہ جگہ نہ ہو۔ ایک مکان کے دروازے کو غور سے دیکھا کی۔ دل کو یقین ہوگیا تھا کہ یہی میرا مکان ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مکان میں گھسی چلی جاؤں۔ ماں کے قدموں پر گروں وہ گلے لگالیں گی۔ مگر جرأت نہ ہوتی تھی۔ اس لیے کہ میں جانتی ہوں کہ دیہات میں رنڈیوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ دوسرے باپ بھائی کی عزت کا خیال تھا۔ نواب صاحب کی باتوں سے معلوم ہوچکا تھا کہ جمعدار کی لڑکی کا نکل جانا لوگوں کو معلوم ہے۔ پھر جی کہتا تھا ہائے کیا غضب ہے صرف ایک دیوار کی آڑ ہے۔ اُدھر میری اماں بیٹھی ہوں گی اور میں یہاں ان کے لیے تڑپ رہی ہوں، ایک نظر صورت دیکھنا بھی ممکن نہیں، کیا مجبوری ہے؟

اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ ایک عورت نے آکے پوچھا "تمھیں لکھنؤ سے آئی ہو؟"

میں:۔ ہاں! اب تو میرا کلیجہ ہاتھوں اچھلنے لگا۔

عورت :۔ اچھا تو ادھر چلی آؤ۔ تمھیں کوئی بلاتا ہے۔

میں :۔ اچھا۔ کہہ کے اس کے ساتھ چلی، ایک ایک پاؤں گویا سو سو من کا ہو گیا تھا۔ قدم رکھتی کہیں تھی پڑتا کہیں تھا۔

وہ عورت اس مکان کے دروازے پر مجھ کو لے گئی جسے میں اپنا مکان سمجھے ہوئے تھی، اس مکان کی ڈیوڑھی میں مجھ کو بٹھا دیا۔ اندر کے دروازے پر ٹاٹ کا پردا پڑا ہوا تھا اس کے پیچھے دو تین عورتیں آ کے کھڑی ہوئیں۔

ایک :۔ لکھنؤ سے تمھیں آئی ہو؟

میں :۔ جی ہاں!

دوسری :۔ تمھارا نام کیا ہے؟

میں :۔ (جی میں تو آیا کہہ دوں امیرن مگر دل کو تھام کے) امراؤ جان۔

پہلی :۔ تمھارا وطن خاص لکھنؤ ہے۔

میں :۔ (اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ آنسو نکل پڑے) اصلی وطن تو یہی ہے جہاں کھڑی ہوں۔

پہلی :۔ تو کیا بنگلے کی رہنے والی ہو؟

میں :۔ (آنکھوں سے آنسو برابر جاری تھے۔ بمشکل جواب دیا) جی ہاں۔

دوسری :۔ کیا تم ذات کی پتریا ہو؟

میں :۔ ذات کی پتریا تو نہیں ہوں تقدیر کا لکھا پورا کرتی ہوں۔

پہلی :۔ (خود رو کے) اچھا تو روتی کیوں ہو۔ آخر کہو پھر تم کون ہو؟

میں :۔ (آنسو پونچھ کے) کیا بتاؤں کون ہوں، کچھ کہتے بن نہیں پڑتا۔

اتنی باتیں میں نے بہت دل سنبھال کے کی تھیں۔ اب بالکل تاب ضبط نہ تھی۔ سینے میں دم رکنے لگا تھا۔

اتنے میں دو عورتیں پردے کے باہر نکلیں ایک کے ہاتھ میں چراغ تھا اس نے میرے منھ کو ہاتھ سے تھام کے کان کی لو کے پاس غور سے دیکھا اور

یہ کہہ کے دوسری کو دکھایا اور کہا "کیوں ہم نہ کہتے تھے وہی ہے"۔

دوسری:۔ ہائے میری امیرن کہہ کے لپٹ گئی۔ دونوں ماں بیٹیاں چیخیں مار مار کے رونے لگیں، ہچکیاں بندھ گئیں۔ آخر دو عورتوں نے آکے چھڑایا۔ اس کے بعد میں نے اپنا سارا قصہ دہرایا، میری ماں بیٹھی سنا کی اور رو دیا کی۔ باقی رات ہم دونوں وہیں بیٹھے رہے۔ صبح ہوتے میں رخصت ہوئی۔ ماں نے چلتے وقت جس حسرت بھری نگاہ سے مجھے دیکھا تھا وہ نگاہ مرنے دم تک مجھے نہ بھولے گی مگر مجبوری۔ روز روشن نہ ہونے پایا تھا کہ سوار ہو کر اپنے کمرے پر چلی آئی۔ دوسرا مجرا صبح کو ہوتا مگر میں نے گھر پر آکے کل روپیہ مجرے کا واپس کر دیا اور بیماری کا بہانہ کہلا بھیجا۔ دولھا کے باپ نے آدھا روپیہ پھیر دیا۔ اس دن، دن بھر جو میرا حال رہا خدا ہی پر خوب روشن ہے۔ کمرے کے دروازے بند کر کے دن بھر پڑی رو یا کی۔

دوسرے دن شام کو کوئی دو گھڑی رات گئے ایک جوان سا آدمی سانولی رنگت کوئی بیس بائیس کا سن، پگڑی باندھے سپاہیوں کی ایسی وردی پہنے، میرے کمرے پر آیا۔ میں نے حقہ بھروا دیا۔ پاندان میں پان نہ تھے ماما کو بلا کے چپکے سے کہا، پان لے آؤ۔ اتفاق سے اور کوئی بھی اس وقت نہ تھا۔ کمرے میں میں ہوں اور وہ ہے۔

جوان:۔ کل تمھیں مجرے کو گئی تھیں؟ یہ اس تیور سے کہا کہ میں جھجک گئی۔

میں:۔ "ہاں" اتنا کہہ کے اس کے چہرے کی طرف جو دیکھا یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔

جوان:۔ (سر نیچا کر کے) خوب گھرانے کا نام روشن کیا۔

میں:۔ (اب سمجھی کہ یہ کون شخص ہے) اس کو تو خدا ہی جانتا ہے۔

جوان:۔ ہم تو سمجھے تھے تم مر گئیں مگر تم اب تک زندہ ہو!

میں:۔ بے غیرت زندگی تھی نہ مری۔ خدا کہیں جلد موت دے۔

جوان :۔ بے شک اس زندگی سے موت لاکھ درجہ بہتر تھی۔ تمھیں تو چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنا تھا۔ کچھ کھا کے سو رہی ہوتیں۔

میں :۔ خود اتنی سمجھ نہ تھی، نہ آج تک کسی نے یہ نیک صلاح دی۔

جوان :۔ اگر ایسی ہی غیرت دار ہوتیں تو اس شہر میں کبھی نہ آتیں اور آئی بھی تھیں تو تمھیں اس محلہ میں مجرے کو نہ آنا تھا جہاں کی رہنے والی تھیں۔

میں :۔ ہاں اتنی خطا ضرور ہوئی مگر مجھے کیا معلوم تھا؟

جوان :۔ اچھا اب تو معلوم ہوگیا؟

میں :۔ اب کیا ہوتا ہے؟

جوان :۔ (بہت ہی غصہ ہوکے) اب کیا ہوتا ہے! اب کیا ہوتا ہے۔ اب (چھری کمر سے نکال کے مجھ پر جھپٹا۔ دونوں ہاتھ پکڑ کے گلے پر چھری رکھ دی) یہ ہوتا ہے۔

اتنے میں ماما بازار سے پان لے کے آئی۔ اس نے جو یہ حال دیکھا لگی چیخنے؛ "ارے دوڑو بیوی کو کوئی مارے ڈالتا ہے۔"

جوان :۔ (چھری گلے سے ہٹا کے ہاتھ چھوڑ دیے) عورت کو کیا ماروں اور عورت بھی کون بڑی .....

اتنا کہہ کے ڈاڑھیں مار مار کے رونے لگا۔

میں پہلے ہی سے رو رہی تھی۔ جب اس نے گلے پر چھری رکھی تھی جان کے خوف سے ایک دھچکا سا کلیجہ پر پہنچا تھا، اس سے دم بخود ہو گئی تھی۔ جب وہ چھوڑ کر رونے لگا میں بھی رونے لگی۔

ماما نے دو ایک چیخیں ماری تھیں۔ جب اس نے یہ حال دیکھا کچھ چپ سی ہو رہی۔ ادھر میں نے اشارہ سے منع کیا، ایک کنارے کھڑی ہو گئی۔

جب دونوں خوب رو دھو چکے۔

جوان :۔ (ہاتھ جوڑ کے) اچھا تو اس شہر سے کہیں چلی جاؤ۔

میں :۔ کل چلی جاؤں گی مگر ایک مرتبہ ماں کو اور دیکھ لیتی۔

جوان :۔ بس اب دل سے دور رکھو۔ معاف کرو۔ کل اماں نے تمھیں گھر پر بلالیا، میں نہ ہوا نہیں تو اسی وقت دارا نیارا ہو جاتا، محلہ بھر میں چرچے ہو رہے ہیں۔

میں :۔ تم نے دیکھ لیا، جان سے تو میں ڈرتی نہیں۔ مگر ہائے تمھاری جان کا خیال ہے۔ تم اپنے بچوں پر سلامت رہو۔ خیر اگر جیتے رہے تو کبھی نہ کبھی خیر و عافیت سن ہی لیا کریں گے۔

جوان :۔ برائے خدا کسی سے ہمارا ذکر نہ کرنا۔

میں :۔ اچھا۔

وہ جوان تو اٹھ کے چلا گیا۔ میں اپنے غم میں مبتلا تھی۔ ماما نے اور جان کھانا شروع کی۔

ماما :۔ یہ کون تھے؟

میں :۔ رنڈی کے مکان پر ہزاروں آدمی آتے ہیں۔ کوئی تھے تمھیں کیا۔

بہر طور ماما کو ٹال دیا۔ رات سو رہی صبح کو اٹھ کے لکھنؤ کے چلنے کی تیاری کی۔ شاموں شام شکرم کرایہ کر کے روانہ ہو گئی۔

کسی طرح سے ہو تسکین شوق، کیسا رشک
ملیں گے آج ہم ان سے، رقیب سے مل کے

اتوار کے دن ۸ بجے صبح کو بیگم صاحب کی مہری فینس اور کہار لے کے سر پر نازل ہو گئی۔ میں ابھی سو کے اٹھی تھی، اچھی طرح حقہ بھی نہ پینے پائی تھی کہ اس نے جلدی مچانا شروع کر دی۔ میں سمجھی تھی کھانا دانا کھا کے جانا ہو گا۔ مہری نے کہا بیگم

صاحبہ نے اپنے سر کی قسم دی ہے کہ کھانا یہیں آ کے کھانا۔ میں نے پوچھا نواب صاحب گھر پر ہیں۔ اس نے کہا نہیں صبح سے اٹھ کے گاؤں کو سدھارے ہیں۔ میں نے پوچھا کب تک آئیں گے؟ مہری نے کہا اب آئیں تو شام کو آئیں۔ مجھے بیگم سے بہت سی باتیں کرنا تھیں اس لیے فوراً اٹھ بیٹھی۔ ہاتھ منھ دھو کے کنگھی چوٹی کر، کپڑے پہن، ایک ماما کو ساتھ لے کے روانہ ہو گئی۔

جا کے جو دیکھا، بیگم صاحب منتظر بیٹھی ہیں۔ میرے جانے کے ساتھ ہی دسترخوان بچھا۔ میں نے اور بیگم صاحبہ نے ساتھ بیٹھ کے کھانا کھایا۔ بہت تکلف کا کھانا تھا۔ پراٹھے، قورمہ، کئی طرح کا سالن، بالائی، مہین چاولوں کا خشکہ، نورتن چٹنی، سیب کا مربہ، حلوا سوہن۔

کھانا کھا کے چپکے سے میرے کان میں۔

بیگم:۔ کیوں وہ کریم کے گھر کی ارہر کی دال اور جوار کی روٹیاں بھی یاد ہیں؟

میں:۔ چپ بھی رہو، کوئی سن نہ لے۔

بیگم:۔ سن لے گا تو کیا ہو گا؟ کیا کوئی جانتا نہیں۔ نواب کی ماں (خدا جنت نصیب کرے) نے مجھے نواب کے لیے مول لیا تھا۔

میں:۔ برائے خدا چپ رہو کہیں علیحدہ چلو تو باتیں ہوں گی۔

کھانا کھا کے ہاتھ منھ دھویا، پان کھایا، مہری نے حقہ لا کے لگایا، بیگم نے سب کو بہانے سے ٹال دیا۔

میں:۔ بارے تم نے مجھے پہچان لیا۔

بیگم:۔ جب تمھیں پہلے پہل کان پور میں دیکھا تھا اُسی دن پہچان لیا تھا۔ پہلے تو بڑی دیر تک الجھن سی ہی تھی، دل میں کہتی تھی میں نے انھیں کہیں دیکھا ہے مگر کہاں دیکھا ہے، یہ کچھ یاد نہیں آتا تھا۔ چاروں طرف خیال دوڑاتی تھی۔ کچھ سمجھ ہی میں نہ آتا تھا۔ اتنے میں کریمن مہری پر نظر پڑی۔ کریمن کے نام پر مونڈی کاٹے کریم کا نام یاد آ گیا۔ دل نے کہا کہ اوہو ہو! انھیں کریم کے مکان پر دیکھا تھا۔

میں:۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ بڑی دیر تک غور کیا کی۔ میری ساتھ والیوں میں ایک خورشید ہے، اس کی صورت تم سے بہت ملتی ہے۔ جب میں خورشید کو دیکھتی تھی تم یاد آجاتی تھیں۔

بیگم:۔ اب میرا حال سنو!

میں جب تم سے جدا ہو کے نواب صاحب کی ماں نواب عمدۃ النسا، بیگم صاحبہ کے ہاتھ بکی ہوں۔ تمھیں یاد ہوگا میرا سن کوئی بارہ برس کا ہوگا۔ نواب کو سولھواں برس تھا۔ نواب کے ابا جان کانپور میں رہتے تھے۔ بیگم صاحب سے ان سے نا اتفاقی رہتی تھی۔ نواب صاحب کے ابا جان نے نواب کی شادی اپنی بہن کی لڑکی کے ساتھ ٹھہرائی تھی۔ ان کا مکان دہلی میں تھا۔ بیگم صاحب کو وہاں شادی کرنا منظور نہ تھا۔ وہ یہ چاہتی تھیں کہ نواب کی شادی ان کے بھائی کی لڑکی کے ساتھ ہو۔ میاں بیوی میں پہلے ہی سے نا اتفاقی تھی، اس بات سے اور ضدیں بڑھیں۔ ابھی یہ جھگڑا طے نہ ہوا تھا کہ نواب کے دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ حکیموں نے تجویز کیا کہ بہت جلد شادی کر دینا چاہیے ورنہ جنون ہو جائے گا۔ شادی ہو جانا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اتنے میں میں پہنچ گئی۔ بیگم صاحب نے مجھے خرید لیا۔

نواب صاحب مجھ پر مائل ہو گئے اور ایسے مائل ہوئے کہ دونوں جگہ کی شادی سے کھلم کھلا انکار کر دیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد خدا کا کرنا ایسا ہوتا ہے کہ بیگم صاحب نے انتقال کیا اور اس کے چند ہی سال بعد بڑے نواب بھی مر گئے۔ ماں باپ دونوں صاحبِ جائداد تھے۔ یہی ایک اکلوتے لڑکے تھے۔ کل دولت انھیں کو ملی۔

خدا نواب صاحب کو سلامت رکھے جن کی بدولت بیگم صاحب بنی ہوئی ہوں اور چین کرتی ہوں، نواب مجھے اسی طرح چاہتے ہیں جیسے کوئی اپنے سہرے جلوے کی بیوی کو چاہتا ہو، میری ظاہر میں تو کسی طرف نگاہ اٹھا کے بھی نہیں دیکھا، یوں اپنے باہر دوست آشناؤں میں جو کچھ چاہتے ہوں کرتے ہوں۔ آخر مرد ذات ہیں کچھ میں ان کے پیچھے تو پھرتی نہیں۔

خدا نے سب آرزوئیں میری پوری کیں۔ اولاد کی ہوس تھی، خدا کے صدقے سے اولاد بھی ہے۔ اب اگر آرزو ہے تو یہ ہے کہ خدا بنّن کو پروان چڑھائے بہو بیاہ کے لاؤں اور ایک پوتا کھلاؤں پھر چاہے مرجاؤں، نواب کے ہاتھوں مٹی عزیز ہوجائے اب تم اپنا حال کہو۔

جب رام دئی یہ باتیں کر رہی تھی مجھے اپنی قسمت پر افسوس آتا تھا اور دل ہی دل میں کہتی تھی، تقدیر ہو تو ایسی ہو۔ ایک میری پھوٹی تقدیر، بکی بھی تو کہاں رنڈی کے گھر میں۔

اس کے بعد میں نے اپنا مختصر حال کہہ سنایا کہ جس سے آپ بخوبی واقف ہیں، میں دن بھر وہیں رہی۔ جب تخلیہ کی باتیں ہوچکیں تو نوکروں کو آواز دی۔ طبلہ کی جوڑی، ستار، طنبورہ یہ سب سامان منگایا۔ گانے بجانے کا جلسہ ہوا۔

جب ہم دونوں اکیلے تھے تو وہ رام دئی تھیں اور میں امیرن۔ سب لوگوں کے سامنے پھر وہ بیگم صاحب ہوگئیں اور میں امراؤ جان۔ تین چار گھنٹے تک گانا بجانا ہوتا رہا۔ بیگم بھی کسی قدر ستار بجالیتی تھیں۔ جب میں گا چکتی تھی تو وہ ستار کی کوئی گت چھیڑ دیتی تھیں۔ ایک مغلانی کا گلا بہت اچھا تھا اس کو گوایا۔ سرِ شام تک بڑے لطف کی صحبت رہی۔

ہاں اے نگاہِ شوق مناسب ہے احتیاط
ایسا نہ ہو کہ بزم میں چرچا کرے کوئی

قریب شام، محل میں نواب صاحب کی آمد آمد کا غل ہوا۔ وہ بے تکلفی کی صحبت برہم ہوگئی۔ طبلے کی جوڑی، ستار، طنبورہ سب چیزیں ہٹا دی گئیں چھپنے والیاں اٹھ اٹھ کے پردے میں جانے لگیں اور سب لوگ اپنے اپنے قرینے سے ہوگئے۔ میں بھی بیگم سے ہٹ کے الگ مقطع بن کے بیٹھ گئی۔ جس دالان میں ہم لوگ بیٹھ

تھے وہاں سے دروازہ کا سامنا تھا۔ پردہ پڑا ہوا تھا، نواب کے انتظار میں اس پردے کی طرف نگاہیں لگی ہوئی تھیں۔ میں بھی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں کسی خدمت گار نے چلا کے کہا نواب صاحب آتے ہیں۔ چند لمحہ کے بعد مہری نے پردہ اٹھا کے کہا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نواب اندر داخل ہوئے۔

میں (صورت دیکھتے ہی دل میں) وہی تو ہیں (سلطان صاحب) ہے ہے کس موقع پر سامنا ہوا ہے۔ نواب کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ پہلے تو کچھ جھجکے پھر بغور میری طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھے۔ میں بھی انھیں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں دیکھتا ہوں جو ان کی طرف تو حیرت ہے
میری نگاہ کا وہ اضطراب دیکھتے ہیں

اب نواب دالان کے قریب پہنچ گئے اور میری ہی طرف دیکھتے جاتے تھے کہ

بیگم:۔ او ہی نواب دیکھتے کیا ہو وہی ہیں امراد جان جو کانپور.....

نواب:۔ (انجان بن کے) ہاں میں نے تم سے پرسوں انھیں کا تذکرہ کیا تھا۔

اب فرش کے قریب پہنچ گئے۔ سب تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ نواب مسند پر بیگم کے پہلو میں اک ذرا سرک کے بیٹھ گئے۔

اب شام ہو گئی تھی، مہری نے دو کنول سفید روشن کر کے سامنے رکھے۔ بیگم پان بنانے لگیں۔ اس عرصہ میں نواب نے آنکھ بچا کے میری طرف دیکھا میں نے کنکھیوں سے انھیں دیکھا۔ اب نہ وہ کچھ کہہ سکتے ہیں نہ میں بول سکتی ہوں۔ منھ سے بولنے کا موقع نہ تھا مگر اس وقت آنکھیں زبان کا کام دے رہی تھیں۔ شکوے شکایت، رمز و کنایہ سب اشاروں میں ہوا کیا۔

نواب:۔ (کسی قدر اجنبیت سے) امراد جان صاحب! واقعی ہم تو آپ کے بہت ہی ممنون ہیں۔ واقعی کانپور میں اس شب کو تمھاری وجہ سے ہمارا گھر لٹنے سے بچ گیا۔

میں:۔ یہ آپ کیوں مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں۔ ایک اتفاقی امر تھا۔

نواب :۔ خیر! جو کچھ ہو وجہ تمھاری تھی۔ خیر اسباب تو وہاں کچھ نہ تھا مگر ایک بڑی خیریت ہوگئی۔ تمام ضروری کاغذات کوٹھی میں موجود تھے۔

میں :۔ حضور ان دنوں جنگل میں عورتوں کو چھوڑ کے کہاں گئے تھے؟

نواب :۔ کیا کہوں ایسی ہی مجبوری تھی۔ لکھنؤ کی جائداد بادشاہ نے ضبط کرلی تھی۔ لاٹ صاحب کے پاس کلکتہ جانا ضرور تھا۔ ایسی عجلت میں گیا تھا کہ نہ کچھ سامان کیا، نہ لیا، نہ دیا۔ صرف شمشیر خاں اور ایک آدمی اور ساتھ لے کے چلا گیا۔

میں :۔ وہ کوٹھی ایسے جنگل میں ہے کہ جو واردات نہ ہو تعجب ہے۔

نواب :۔ سوائے اس واقعہ کے اور کوئی واردات کبھی نہیں ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ غدر ہونے کو تھا، بدمعاشوں نے سر اٹھایا تھا، ملک میں اندھیر مچا تھا۔

اس کے بعد اور ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں پھر دسترخوان بچھا۔ سب نے مل کے ساتھ کھانا کھایا۔ جب حقہ پان سے فراغت ہو چکی تو نواب نے گانے کی فرمائش کی میں نے یہ غزل شروع کی۔

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی — اسی کافر کی ادا یاد آئی
تم کو الفت نہ وفا یاد آئی — یاد آئی تو جفا یاد آئی
ہجر کی رات گزر ہی جاتی — کیوں تری زلفِ رسا یاد آئی
تم جدائی میں بہت یاد آئے — موت تم سے بھی سوا یاد آئی
لذتِ معصیتِ عشق نہ پوچھ — خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی
چارہ گر زہر منگا دے تھوڑا — لے مجھے اپنی دوا یاد آئی

اور شعر یاد نہیں مقطع یہ ہے

کیا غزل کوئی کہے ہے
آج کیوں بادِ صبا یاد آئی

برسات کے دن ہیں پانی جھاجھم برس رہا ہے۔ آموں کی فصل ہے، میرے کمرے میں مجمع ہے۔ بسم اللہ جان، امیر جان، بیگا جان، خورشید جان رنڈیوں میں۔ نواب

بن صاحب، نواب چھبن صاحب، گوہر مرزا، عاشق حسین، تفضل حسین، امجد علی اکبر علی خاں، مردوں میں۔ یہ سب صاحب موجود ہیں، گانا ہو رہا ہے۔ اتنے میں بسم اللہ "بھئی ہوگا، گانا تو روز ہوا کرتا ہے، اس وقت تو کڑھائی چڑھاؤ کچھ پکوان پکاؤ دیکھو کیسا مینھ برس رہا ہے۔"

میں:۔ ادھر بازار سے جو جی چاہے منگوالو۔

خورشید:۔ بازار سے منگوالو یہ خوب کہی۔ اپنے ہاتھ سے پکانے میں مزا ہی اور ہے۔

امیر:۔ بہن تمھیں ہنڈیا ٹھونکنے کا مزہ ہے ہم نے نہ تو کبھی پکایا ہے نہ پکانے کی قدر جانتے ہیں۔

بیگا:۔ تو پھر وہی بازار کی ٹھہری۔

میں:۔ اے ہے باجی کیا بھوکی ہو۔

بیگا:۔ میں تو بھوکی نہیں ہوں، بسم اللہ سے پوچھو انھوں نے صلاح دی تھی۔

بسم اللہ:۔ بھئی کچھ نہ کچھ تو آج ہونا چاہیے۔

میں:۔ بتاؤں، چلو بخشی کے تالاب چلیں۔

بسم اللہ:۔ ہاں بھئی کیا بات کہی؟

خورشید:۔ خوب سیر ہوگی۔

بیگا:۔ ہم بھی چلیں گے

میں:۔ اچھا تو سامان کرو۔

بات کرنے میں تین گاڑیاں کرایہ پر آگئیں۔ کھانے پکانے کا سامان گاڑیوں پر لدوایا گیا۔ دو چھول داریاں نواب بن صاحب کے گھر سے آگئیں۔ سب گاڑیوں پر سوار ہو کے روانہ ہو گئے۔

گومتی پار پہنچ کے گانا شروع ہوا، اس دن بیگا جان کا گانا

جھولا کن ڈارو رے امریاں

کیا کیا تانیں لی ہیں کہ دل پسا جاتا تھا۔

شہر سے نکل کے جنگل کا سامان قابلِ دید تھا، جدھر نگاہ جاتی ہے سبزہ ہی سبزہ

نظر آتا ہے۔ بادل چاروں طرف گھرے ہوئے ہیں، مینھ برس رہا ہے، درختوں کے پتوں سے پانی ٹپک رہا ہے۔ نالے ندیاں بھری ہوئی ہیں، مور ناچ رہے ہیں، کوئل کوک رہی ہے۔ بات کہتے میں تالاب پر پہنچ گئے۔ بارہ دری میں فرش کیا گیا چولھے بن گئے کڑاہیاں چڑھ گئیں، پوریاں تلی جانے لگیں۔ نواب چھبن صاحب برساتی پہن کے شکار کو نکل گئے۔ گوہر مرزا آموں کی کھانچیاں چکا لائے۔ اتنی دیر میں نوکروں نے سڑک کے کنارے باغ میں چھول داریاں گاڑ دیں۔ گاؤں سے چارپائیاں آگئیں، یہاں اور ہی لطف تھا۔ آم ٹپک رہے ہیں۔ ایک ایک آم پر چار چار آدمی ٹوٹے پڑتے ہیں۔ پانی میں چھپکے لگا رہے ہیں۔ کوئی اُدھر دوڑا جاتا ہے کوئی ادھر۔ آپس میں دھینگا مشتی ہو رہی ہے اب اس میں اگر کوئی گر پڑا تو کیچڑ میں لت پت۔ تھوڑی دیر پانی میں جا کے کھڑے ہو گئے پھر ویسے ہی صاف۔ جن کے مزاج میں کسی قدر احتیاط تھی، جیسے باجی بیگا جان وہ چھولداری میں بیٹھی رہیں۔

بسم اللہ نے پیچھے سے جا کے منھ پر آم کا رس مل دیا پھر ان کی چیخیں اور سب کا قہقہہ لگانا دیکھنے کا تماشہ تھا۔

نہیں معلوم کہاں سے بہتی بہاتی تین نٹنیاں آنکلیں، ان کو گوانا شروع کیا۔ ان کے ساتھ کا ڈھولکی والا غضب کی ڈھولکی بجاتا تھا۔ بھلا ان کا ناچ گانا ہم لوگوں کو کیا اچھا معلوم ہوتا مگر اس موسم میں اور ویسی جگہ کچھ ایسا نامناسب نہ تھا۔ دو گھڑی دن رہے ہماری قسمت سے آسمان کھل گیا، دھوپ نکل آئی۔ ہم لوگ احتیاطاً ایک ایک جوڑا گھر سے لیتے آئے تھے۔ سب نے کپڑے بدلے، جنگل کی سیر کو نکلے۔

میں بھی اکیلی ایک طرف کو روانہ ہوئی۔ سامنے گنجان درخت تھے، سورج انھیں گنجان درختوں کی آڑ میں ڈوب رہا تھا۔ سبزے پر سنہری کرنوں کے پڑنے سے عجیب کیفیت تھی۔ جا بجا جنگلی پھول کھلے تھے۔ چڑیاں سبزے کی تلاش میں اِدھر اُدھر اڑ رہی تھیں۔ سامنے جھیل کے پانی پر آفتاب کی شعاع سے وہ عالم نظر آتا تھا جیسے پگھلا ہوا سونا تھلک رہا ہے۔ درختوں کے پتوں کی آڑ میں سورج کی کرنیں اور ہی عالم

دکھا رہی ہیں۔ آسمان پر سرخ شفق پھوٹی ہوئی تھی۔ اس وقت کا سماں ایسا نہ تھا کہ ایک خفقانی مزاج کی عورت جیسی کہ میں ہوں، جلدی سے چھول داری میں چلی آتی۔ یہ تماشہ دیکھی ہوئی خدا جانے کتنی دور نکل گئی۔ آگے جا کر ایک کچی سڑک ملی۔ اس پر کچھ گنوار راستہ چل رہے تھے۔ کسی کے کندھے پر ہل تھا، کوئی بیلوں کو ہانکتا ہوا چلا آتا تھا۔ ایک چھوٹی سی لڑکی گائے بھینس لیے ہوئے چلی جاتی تھی۔ ایک لڑکا بہت سی بھیڑیں اور بکریوں کے پیچھے تھا۔ یہ سب آنکھوں کے سامنے آئے اور پھر نظروں سے غائب ہو گئے۔ میں پھر اکیلی رہ گئی۔ نہیں معلوم کس دھن میں تھی۔ مگر اب میں سڑک پر چلنے لگی۔ اپنے نزدیک میں اب گویا تالاب کی طرف چل رہی ہوں۔ اب اندھیرا ہوتا جاتا ہے سورج ڈوبنے ہی کو ہے۔ اب میرا قدم جلد جلد اٹھ رہا ہے۔ آگے چل کر ایک فقیر کا تکیہ ملا۔ یہاں کچھ لوگ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ یہاں میں نے تالاب کا راستہ پوچھا۔ معلوم ہوا کہ میں لکھنؤ کی سڑک پر بار ہی ہوں تالاب دہنے کو چھوٹ گیا ہے۔ یہاں سڑک چھوڑنا پڑی۔ ایک بیہڑ میں سے ہو کے راستہ تھا۔ تھوڑی دور جا کے ایک نالہ ملا۔ نالہ کے اس پار تھوڑے فاصلہ پر دو تین درخت تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان درختوں کی جڑ سے ذرا ہٹ کے کوئی شخص میلی سی دھوتی باندھے، مرزئی پہنے ایک میلا سا چادرہ کمر سے لپٹا ہوا کھرپی ہاتھ میں لیے کچھ کھود رہا ہے۔ میرے اس شخص کے چار آنکھیں ہوئیں۔ پہلے تو کچھ شبہ سا ہوا پھر ایک مرتبہ غور سے دیکھا اب قریب یقین کے ہو گیا کہ وہی ہے۔ چاہتی تھی کہ منھ پھیر لوں مگر نگاہ کمبخت اسی طرف لڑی رہی۔ اب تو بالکل یقین ہو گیا قریب تھا کہ غش کھا کے گر پڑوں اور ضرور ہی گر پڑتی۔ اتنے میں دور سے اکبر علی خاں کے نوکر سلار بخش کی آواز کان میں آئی۔ مجھے ڈھونڈھنے نکلا تھا۔ مجھے آتا دیکھ کر دلاور خاں نے کھرپی ہاتھ سے رکھ دی تھی۔ جس طرح میں اسے دیکھ رہی تھی وہ بھی مجھ کو دیکھ رہا تھا مگر یقیناً مجھے اس نے نہ پہچانا ہو گا۔ میں نے اس کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔

سلار بخش کی آواز سن کر وہ نالے کی طرف بھاگا۔ اتنے میں سلار بخش میرے

پاس پہنچ گیا۔ میں مارے خوف کے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ آواز منھ سے نہیں نکلتی تھی۔ گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ سلار بخش نے میرا یہ حال دیکھ کے کہا۔ ہائیں! ڈر گئیں۔ میں نے درخت کی طرف اشارہ کیا۔ سلار بخش اس طرف دیکھنے لگا۔

سلار بخش:۔ وہاں کیا دھرا ہوا ہے؟ ایک کھرپی پڑی ہے۔ واہ اس سے ڈر گئیں۔ آپ سمجھیں کوئی قبر کھود رہا ہے اور وہ گیا کہاں جو کھود رہا تھا۔

میں:۔ منھ سے تو بولا نہ گیا، ہاتھ سے نالے کی طرف اشارہ کیا۔

سلار بخش:۔ چلم پینے گیا ہوگا تکیے پر۔ اچھا تو چلیے، نواب چھبن صاحب بہت سی مرغیاں شکار کر کے لائے ہیں۔ آپ کا کہیں پتہ نہیں۔ میاں ادھر ڈھونڈھنے گئے ہیں۔ میں ادھر آیا۔ کہیے آپ مل گئیں نہیں تو آپ کو راستہ نہ ملتا۔

میں نے ہاں، نا کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ آخر سلار بخش بھی چپ ہو رہا۔ تھوڑی دیر میں کھیتوں سے ہو کے تالاب پر پہنچ گئی۔

رات کو یہیں رہنے کی ٹھہری۔ جب کھانے وانے سے فراغت ہو گئی میں نے اکبر علی خاں سے کل واقعہ بیان کیا۔

اکبر علی خاں:۔ تم نے اچھی طرح سے دیکھا یہ وہی دلاور خاں تھا فیض آباد کا رہنے والا؟ اِس کا تو حلیہ جاری ہے۔ افسوس تم نے پہلے سے نہ کہا۔ بدمعاش کو چل کے گرفتار کرتے، بڑا نام ہوتا، سرکار سے انعام ملتا۔ ایک ہزار کا اشتہار ہے اور یہ کھودتا کیا تھا؟

میں:۔ کیا معلوم؟ موا اپنی قبر کھودتا ہوگا۔

اکبر علی خاں:۔ اس کے نام سے تمھارے منھ پر ہوائیاں چھوٹنے لگتی ہیں۔ اب وہ تمھارا کیا کر سکتا ہے

میں:۔ (دل کو ذرا تھام کے) ضرور اس نے غدر کے زمانے میں وہاں کچھ گاڑ دیا ہوگا، اسے کھودنے آیا ہے۔

اکبر علی خاں:۔ چلو دیکھیں!

میں :۔ میں تو نہ جاؤں گی۔

اکبر علی خاں :۔ میں تو جاتا ہوں۔ سلار بخش کو لیے جاتا ہوں۔

میں :۔ کہاں جاؤ گے اب وہاں کچھ دھرا ہو گا؟ وہ کھود کے لے بھی گیا ہو گا۔

اکبر علی خاں :۔ میں تو ضرور جاؤں گا۔

یہ ذرا زور سے کہا۔ پاس نواب چھبن صاحب کی چھول داری تھی۔ وہ اور بسم اللہ دونوں جاگ رہے تھے۔

نواب :۔ خاں صاحب کہاں جائیے گا؟

اکبر علی خاں :۔ نواب صاحب ابھی آپ نے آرام نہیں کیا۔

نواب :۔ جی نہیں

اکبر علی خاں :۔ میں حاضر ہوں

نواب :۔ آئیے

اکبر علی خاں اور میں دونوں نواب کی چھول داری میں گئے۔ کل واقعہ بیان کیا۔

نواب :۔ (مجھ سے) اور تم اس بدمعاش کو کیا جانو؟

میں :۔ (اپنی سرگزشت تو ان سے کیا کہتی) میں جانتی ہوں اور اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں بھی فیض آباد کی رہنے والی ہوں۔

نواب :۔ اخاہ! آپ بھی فیض آباد کی رہنے والی ہیں۔

اکبر علی خاں :۔ مگر اس مردود کا کوئی بندوبست کرنا چاہیے۔ ایسے میں یہیں کہیں ہے۔ عجب نہیں گرفتار ہو جائے۔ یہ کہہ کے سلار بخش کو آواز دی۔ قلم دان منگوایا تھانہ قریب تھانہ دار کو رقعہ لکھا۔

تھوڑی دیر میں تھانہ دار صاحب مع دس بارہ سپاہیوں کے آموجود ہوئے۔ میں نے جو دیکھا تھا، ان سے کہہ دیا۔ گاؤں سے پاسی بلوائے گئے۔ پہلے اس موقع پر جا کے ڈھونڈھا۔ تکیہ پر فقیر سے کسی قدر سراغ اور ملا۔ ایک سپاہی کو ایک اشرفی شاہی زمانے کی ملی۔ وہ تھانہ دار صاحب کے پاس لے آیا۔

تھانے دار:۔ خدا چاہے تو مع مال گرفتار ہوگا۔

تھانے دار صاحب نے واقعی اچھا بندوبست کیا۔ سپاہیوں نے بھی خوب ہی تگ و دو کی۔ آخر تین بجے رات کو مکا گنج میں گرفتار ہوا۔ صبح ہوتے ہوتے تالاب پہنچ گیا۔ تلاشی میں ۲۴ اشرفیاں برآمد ہوئیں۔ میں شناخت کے لیے بلوائی گئی۔ میری شناخت کے علاوہ دو سپاہیوں نے بھی پہچانا۔ دس بجے چالان لکھنؤ کو روانہ ہوگیا۔

مرزا رسوا:۔ اچھا تو پھر اس کا حشر کیا ہوا؟ اس قصے کو جلدی ختم کیجیے۔

امراؤ:۔ ہوا کیا۔ کوئی دو مہینے کے بعد معلوم ہوا پھانسی ہوگئی۔ واصلِ جہنم ہوا۔

اقتباس

شریف زادہ

مرزا عابد حسین جب اودھ کے ایک ضلع میں پہلے پہل ملازم ہو کے گئے، سرا میں اترے۔ صاحب کی ملاقات کی۔ کار سرکاری سپرد ہوا۔ اس عرصے میں اُس بستی کے بہت سے لوگ ان کو پہچاننے لگے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ چھوٹی بستیوں میں بہ نسبت بڑے شہروں کے بہت جلد شہرت ہو جاتی ہے۔ دو ایک صاحب شریف صورت اُس بستی کے رہنے والے جو اپنے ذاتی منافع کے باب میں بڑے خوش نگر اور دور اندیش ہوتے ہیں۔ اُن سے سرا میں آ کے ملے۔ ایسے لوگوں کو خواہ مخواہ فکریں رہتی ہیں کہ فلاں عہدے پر کون شخص مقرر ہوا۔ کس کی تبدیلی ہوئی۔ کس کی ترقی ہوئی۔ کس کا تنزل ہوا۔ غرض کہ یہ لوگ زندہ گزٹ ہوتے ہیں اور لطف یہ کہ نہ کہیں نوکر نہ چاکر۔ نہ کوئی ذاتی معاملہ نہ مقدمہ مگر ان باتوں سے بڑے بڑے مطلب نکال لیتے ہیں۔ حکام رسی۔ اہل عملہ سے حسب حیثیت رسم و راہ۔ یہ خاص اوصاف ہیں جو منجملہ فضائل سمجھے جاتے ہیں۔

مرزا صاحب سے جو لوگ آ کے ملے اُن میں سے ایک صاحب قدوی میاں خاندانی رئیس اس بستی کے تھے۔ مگر یہ شرف انقلاب روزگار یا موروثی غفلت اور اسراف یا خود اُن کی اولوالعزمی یا شرکا کے تنازع قانونی یا کارندوں کی چالاکی کی وجہ سے اب صرف اضافی رہ گیا تھا۔ اگرچہ زمانۂ سابق میں اُن کے بزرگ زمیں دار تھے۔ مگر اب بسرف برائے نام ایک موضع کا نمبر آپ کے

نام سے رہ گیا تھا۔ اگرچہ اُس پر بھی تصرف مالکانہ اِن کے ایک کارندہ تھا شیورتن کا تھا۔ جو کہ درحقیقت اسی گھر کا ساختہ پرداختہ تھا مگر اب خود اِن سے بدرجہا متمول اور ان کی کل موروثی جائداد کا اصلی مالک تھا۔ مگر بہ لحاظ اخلاق ظاہری جو کہ اکثر کسی مصلحت پر مبنی ہوتا ہے وہ ابھی تک اِن سے بہ مراعات پیش آتا تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ موضع سجن پور جہاں کا وہ اصلی باشندہ تھا۔ اُسی کے بہ برائے نام نمبردار تھے۔ تحصیل وصول شیورتن کے پاس تھی۔ مگر رعایا ابھی تک انھیں کا رعب و داب مانتی تھی۔ آسامیوں سے دبا کے کبھی کبھی کچھ انھیں بھی وصول ہو جایا کرتا تھا۔ ایک اور وجہ شیورتن کی ان سے دبنے کی یہ تھی کہ شیورتن ایک چھوٹے درجہ کا آدمی تھا اور بستی کے لوگ بہ سبب ان کی قدیمی ریاست کے اِن کو مانتے تھے اور اسی خصوصیت کے لحاظ سے حکام اور اہلِ عملہ تک ان کی رسائی بہ سہولت ہو سکتی تھی۔ شیورتن کو ان سے بہت مدد ملتی تھی۔ اس لیے کہ اکثر مقدمات میں سعی، سفارش، کہنا، سننا جو کچھ ہوتا تھا وہ انھیں کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔ یہ دوا دوش اور تملق و چاپلوسی جو اکثر موقعوں پر کرنا پڑتی تھی اس کا تمام فائدہ شیورتن کو حاصل ہوتا تھا۔ آپ کا منشا صرف اس قدر تھا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ فدوی علاقہ دار ہے اور فدوی کے قبضے میں ابھی کُل مواضع ہیں اور شیورتن صرف ایک کارندہ ہے۔ صرف اِس قدر تفاخر کے تحفظ کے واسطے آپ ہر طرح کی مشقتیں اور صعوبتیں گوارا کرتے تھے۔ بستی میں جس قدر مکانات آپ کے بزرگوں کے تھے وہ اب شیورتن کے قبضے میں تھے اور اُن میں اکثر اہلِ عملہ رہا کرتے تھے۔ اُس کا کرایہ شیورتن ماہ بہ ماہ وصول کر لیتا تھا۔ از بسکہ کرایہ لینا آپ اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ لہٰذا اگر کبھی اس کا ذکر کسی موقع پر آیا تو آپ اُس سے تحاشی فرماتے تھے اور شیورتن کو غائبانہ کلمات ناملائم سے یاد فرماتے۔

اسم مبارک آپ کا فدا علی تھا۔ مگر اس نام سے لوگ بہت کم واقف تھے۔ لوگ آپ کو اکثر قدوی میاں کے نام سے جانتے تھے۔ آپ کا خود یہ بیان تھا کہ

فدوی تخلص ہے۔ مگر اصل وجہ یہ تھی کہ ابتدائے سال میں آپ اس لفظ کو اپنی نسبت بہت استعمال فرماتے تھے۔ مثلاً "فدوی حاضر ہوا تھا" اور "فدوی غائب ہوا" اور "عرض فدوی کی یہ ہے" اور "فدوی آپ کا قدیمی نیاز مند ہے"۔ اس لفظ کے کثرت استعمال کی وجہ سے لوگوں نے آپ کا نام فدوی میاں رکھ لیا۔ پہلے غائبانہ اور پھر بالمشافہ اسی اسم سے موسوم ہو گئے۔ آپ نے مصلحتاً یہی تخلص اپنا قرار دے لیا۔ کیوں کہ آپ کے تخلص کی (جو اب کسی کو یاد بھی نہ تھا) شہرت نہ ہونے پائی کہ یہ لقب مشہور ہو گیا۔ ایسی حالت میں اُس تخلص کو بٹہ کھاتہ میں ڈال کر دم نقد یہ تخلص اختیار کر لینا عین مصلحت تھی۔

مرزا عابد حسین کے تقرر کی خبر ضلع میں اُن کے آنے سے پہلے آپ کو مل گئی تھی۔ جس دن آپ تشریف لائے اس کے دوسرے ہی دن آپ سرامین پہنچ گئے پھر ملاقات کر لینا کتنی بڑی بات تھی۔

مرزا صاحب چار بجے کے بعد سرامین آ کے ابھی بیٹھے ہی تھے کہ آپ نازل ہوئے اور بھٹیاری سے دریافت کر کے بے تکلف مرزا صاحب کے پاس چلے آئے۔

فدوی:۔ فدوی آداب عرض کرتا ہے۔

مرزا صاحب:۔ تسلیم۔

مرزا صاحب بہت دیر آشنا تھے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وضع تہذیب کے پابند نہ ہوں۔ جب ایک شریف صورت اس طرح تعارف کرے تو اس سے بے رخی کریں۔

آئیے تشریف لائیے۔

اس طرف اتفاق سے بھٹیارہ اس طرف کسی ضرورت سے آنکلا۔ اُس نے کہا "فدوی میاں سلام" اسی طرح کئی شخصوں نے آپ کو سلام کیا۔ چلیے نام بتانے کی کبھی ضرورت نہ ہوئی۔ مرزا صاحب کو معلوم ہو گیا کہ آپ اس لقب

سے ملقب ہیں۔ اس پر بھی مرزا صاحب نے ازراہ احتیاط اسم مبارک دریافت کیا۔

فدوی میاں:۔ بس یہی "فدوی"

مرزا صاحب:۔ (کسی قدر تعجب سے) درست!

فدوی میاں:۔ جی ہاں۔ وہ اصل حقیقت یہ ہے کہ نام تو میرا فدا علی ہے مگر فدوی کا تخلص ہے۔ یہی زبان زد ہر کس و ناکس ہو گیا۔

مرزا صاحب:۔ بہت مبارک!

فدوی میاں:۔ آپ کی تشریف آوری کی خبر سن کے میں بہت مشتاق تھا کہ آپ سے ملوں اس لیے کہ یہاں حکام اور اہلِ عملہ میں کوئی صاحب ایسے نہیں ہیں جو فدوی کو نہ جانتے ہوں۔

مرزا صاحب:۔ میں جانتا ہوں کہ اکثر صاحبوں کو اس قسم کا شوق ہوتا ہے۔

فدوی میاں:۔ جی ہاں شوق کیا، ایک لت سی ہے۔ آپ جانیے یار باشی میں تو وہ مزہ ہے کہ جہاں اس کا چسکا پڑا پھر نہیں چھوٹتا۔

مرزا صاحب:۔ صحیح ہے جس کو جس بات کا شوق ہو جائے۔ اگر اس میں تضیع اوقات بھی ہو، مگر انسان سے بہ مشکل ترک ہو سکتا ہے۔

مرزا صاحب کے ان بلیغ فقروں کا مطلب یا تو فدوی میاں سمجھے نہیں یا سمجھ بوجھ کے تجاہلِ عارفانہ فرمایا۔ اس لیے کہ مرزا صاحب تو کچھ ایسے کھرے تھے بھی نہیں۔ آپ تو ایسے ایسے حکام اور اہل کاروں سے مل چکے تھے جو رُکھائی میں شہرۂ آفاق تھے، اور فدوی کو اس بات کا فخر تھا۔ مرزا صاحب کیا چیز تھے۔ جیمس صاحب جو بیہودہ ملاقاتوں سے اس قدر نافر اور ہارب تھے کہ جو کوئی بلاوجہ ان کی ملاقات کو جاتا تھا ڈنڈا لے کے پیچھے دوڑتے تھے۔ ان سے بھی فدوی میاں مل چکے تھے اور جب تک وہ اس ضلع میں رہے برابر ہر دوشنبہ کو سلام کے لیے جایا کیے۔ علیٰ ہٰذا القیاس ڈپٹی تہور حسین خاں صاحب جنھوں نے اپنے

بنگلے پر تختی لکھ کے لگا دی تھی کہ کوئی میری ملاقات کو نہ آئے۔ وہاں بھی فدوی پہنچ گئے اور آخر اس قدر رسم بہم پہنچایا کہ اُن کا پیچوان پیا۔ ان کے خاصدان سے پان کھایا۔

فدوی میاں:۔ (مرزا عابد حسین سے) یہاں سرا میں تو آپ کو تکلیف ہوگی۔

مرزا صاحب:۔ جی ہاں۔ ابھی کل تو آیا ہوں۔ مکان تلاش کر کے اُٹھ جاؤں گا

فدوی میاں:۔ فدوی کے مکانات لاتعداد لاتحصیٰ ہیں۔ خالی پڑے ہیں۔ جو پسند آئے اس میں اُٹھ چلیے۔

مرزا صاحب:۔ (کسی قدر تامل کے بعد) کس کرائے کے مکانات ہوں گے۔

فدوی میاں:۔ (مسکرا کے) آپ کو معلوم نہیں دیہات میں اس بات کا عیب ہے۔

مرزا صاحب:۔ مگر میں اس کو معیوب سمجھتا ہوں کہ بلا کرایہ کسی کے مکان پر رہوں۔

فدوی میاں:۔ مگر جب کسی غیر کا مکان ہو نہ۔ مرزا صاحب اس کا جواب دینے ہی کو تھے کہ میرے آپ کے کب کی شناسائی ہے مگر اسی اثنا میں ان سے ایک اور صاحب ملنے کو آ گئے۔

پنڈت جانکی پرشاد صاحب۔ اِن کے ہم مکتب دوست جو اس ضلع میں تھانہ دار تھے، مرزا صاحب ان سے مخاطب ہو گئے۔ فدوی میاں سے اُن سے حسب معمول بے تکلفی کی ملاقات تھی۔ بلکہ کچھ مذاق بھی فیما بین ہوتا تھا۔ مکان کا تذکرہ پنڈت صاحب کے سامنے بھی ہوا۔ پنڈت صاحب نے بھی یہی کہا کہ فدوی میاں کے کئی مکان خالی ہیں۔ کوئی ان میں سے پسند کر کے اٹھ جائیے۔ ایک عہدہ دار پولیس کے کہنے سے مرزا عابد حسین کو یہ تو اطمینان ہوا کہ فدوی میاں قابل اعتماد شخص ہیں۔ مگر۔

مرزا صاحب:۔ مگر آپ فرماتے ہیں کہ میں کرایہ نہ لوں گا۔

پنڈت صاحب:۔ اچھا۔ اُٹھ جائیے۔ حسابِ دوستاں در دل کا معاملہ ہو جائے گا۔

مرزا صاحب اس معمّے کو نہ سمجھے، مگر چپ ہو رہے۔ اس اثنا میں فدوی میاں کسی ضرورت سے اٹھ گئے۔

پنڈت صاحب نے اصل حقیقت مرزا صاحب کے ذہن نشین کر دی۔ معلوم ہوا کہ مکان کا اصل مالک شیو رتن ہے وہ آپ کے گھر کا کارندہ تھا۔ اس لیے آپ اس کو مال مملوک سمجھ کے اپنا مال سمجھتے ہیں۔

مرزا عابد حسین:۔ مگر یہ تو کہیے۔ یہ حضرت میرے اوقات میں تو ہارج نہ ہوں گے۔ کیوں کہ آپ جانتے ہیں میں اس قسم کی ملاقاتوں سے گھبراتا ہوں۔

پنڈت صاحب:۔ کچھ ایسے ہارج نہ ہوں گے۔ مکان میرے دیکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بڑا مکان جو آج کل خالی ہے اس میں پہلے تحصیلدار صاحب رہتے تھے۔ آپ کی قسمت سے ان کی تبدیلی ہو گئی۔ فوراً لے لیجیے نہیں تو کوئی نہ کوئی لے لے گا اور آپ کو افسوس ہو گا۔ ان کے ہارج ہونے کی یہ صورت ہے کہ اس قسم کے لوگ جو بہت لوگوں سے ملتے رہتے ہیں، وہ کسی قدر مزاج شناس ہو جاتے ہیں۔ وہ آئیں گے ضرور۔ خواہ ان کے مکان میں رہیے خواہ نہ رہیے۔ مگر جب آپ منھ نہ لگائیں گے دو چار منٹ ٹھہر کے چلے جایا کریں گے۔ آپ کا ہرج ہی کیا ہو گا۔ دوسرے ایک فائدہ بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جس چیز کی ضرورت ہو (مسکرا کے) خواہ کیسی ہی ضرورت کیوں نہ ہو یہ مہیا کر دیتے ہیں۔ اور لطف یہ کہ بہ کفایت مرزا صاحب۔ پنڈت جی کے اس موقع پر مسکرانے سے کسی قدر بدظن ہو گئے تھے۔ مگر پنڈت جی نے اپنی تقریر کو اس طرح جاری کیا۔

پنڈت جی:۔ مثلاً سال فی الحال تو آپ کو گھوڑے کی ضرورت ہو گی۔ وہ آپ کی معرفت بہت جلد اور کفایت سے مل سکے گا۔ ماہواری غلّہ، گڑ گھی

راب جس شے کی ضرورت ہوگی ان کی معرفت مل جایا کرے گی۔ اسباب ضروری مثل پلنگ، میز، کرسیاں، دریاں، برتن، باسن یہ سب انھیں سے منگوائیے گا۔

مرزا صاحب:۔ مگر ان سب کا معاوضہ کیا دینا ہوگا۔

پنڈت صاحب:۔ کوئی معاوضہ نہیں۔ صرف وہی چند منٹ ہرج اوقات جو ان کے آنے سے ہوگا یا اگر کچھ کمیشن وغیرہ لیتے ہوں تو اس کا علم نہیں۔

مرزا صاحب:۔ اچھا اگر کمیشن لے کے عمدہ شے بہم پہنچا دیتے ہیں تو یہ کچھ ایسا معیوب نہیں۔

پنڈت جی:۔ ہاں بس یہی سمجھ لیجیے۔ میرا جہاں تک خیال ہے آپ کو ان کی ذات سے کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ ممکن ہے کہ کچھ فائدہ ہو جائے۔

مرزا صاحب:۔ باہمی فائدہ رسانی تمدن کا اصل اصول ہے۔ اس کا میں منکر نہیں ہوں۔ مگر وہ معاملات جن میں طرفین سے غیر کافی معاوضہ پر کوئی شے ایک سے دوسرے کی طرف منتقل کی جائے یا کوئی کام کیا جائے اس کو میں ناجائز سمجھتا ہوں۔

پنڈت جی:۔ یہ دقیق منطق تو میری فہم سے باہر ہے۔ میرے کہنے کا خلاصہ یہ ہے کہ مکان لے لیجیے پھر جس طرح چاہیے ان سے معاملت رکھیے گا۔

مرزا عابد حسین:۔ پنڈت صاحب اصل امر تو یہ ہے کہ ایسے شخص کی معرفت مکان لینا بھی کسی قدر مسلک احتیات سے دور ہے۔ مگر آپ فرماتے ہیں کہ اور کوئی مکان نہیں مل سکتا اور اصل معاملہ ایک شخص ثالث سے ہے کہ جس کا نام آپ نے لیا تھا۔

پنڈت جی:۔ شیو رتن۔

مرزا صاحب:۔ شیو رتن سے۔ لہذا مکان لیے لیتا ہوں۔ مگر ان کے اس عجیب اخلاق کی وجہ سے مجھے خواہ مخواہ ایک قسم کا تعلق خاطر ہو گیا۔ لکھنؤ

جو کہ میرا وطن اصلی ہے۔ وہاں کے عامیانہ اطوار و اوضاع سے مجھے نفرت ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ باہر جا کے ایسے لوگوں سے دور رہوں گا مگر یہاں بھی وہی سامنا ہوا۔

پنڈت جی:۔ جی ہاں کیا کیا جائے۔ باہمیں مردماں بباید ساخت۔ اس کے بعد پنڈت جی رخصت ہونے کو تھے کہ فدوی میاں پھر نازل ہو گئے اور آتے ہی

پنڈت جی:۔ پھر مکان دیکھ لیجیے۔ مرزا صاحب نے پھر ذرا تامل کیا۔ مگر پنڈت جی بھی فدوی کے ہم زبان ہو گئے۔ لہٰذا مرزا صاحب بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔

پنڈت جی کی ٹمٹم سرا میں موجود تھی۔ مرزا صاحب اور پنڈت جی داہنے بائیں اور عقب میں فدوی میاں اور ایک حوالدار جو پنڈت جی کے ساتھ تھا بیٹھ لیے گاڑی روانہ ہوئی۔ راستہ میں فدوی میاں اور حوالدار میں بڑے تپاک سے باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ جس قدر حوالدار پنڈت جی کی ہمراہی کی وجہ سے لحاظ کرتا تھا اسی قدر فدوی میاں بے باک تھے۔

اثنائے راہ میں بلا مبالغہ سو دو سو آدمیوں نے فدوی میاں کو سلام کیا ہو گا۔

فدوی میاں سلام! فدوی میاں سلام! یہ صدائیں دس دس بارہ بارہ قدم کے فاصلے سے سنائی دیتی تھیں۔

سلاموں کی ترتیب یہ تھی کہ جو ملا اس نے پہلے تھانہ دار صاحب کو سلام کیا۔ ماتھے پر ہاتھ رکھ کے اور بہت مؤدبانہ جھک کے۔ یہ اوّل درجے کا سلام تھا۔ دوسرے درجے کا سلام مرزا صاحب کو کیا مگر وہ بھی بلا صوت و صدا۔ تیسرا سلام ان لفظوں کے ساتھ حوالدار صاحب سلام۔ ہاتھ پر ہاتھ ابھی تک رہتا تھا۔ چوتھا سلام آوازِ بلند کے ساتھ فدوی میاں سلام!

فدوی میاں کا جواب بھی خصوصیات کے ساتھ ہوتا تھا۔ بھیا سلام، بہتو سلام۔ اس درمیان میں کئی دیہاتی رنڈیوں نے بھی سلام کیا۔ فدوی میاں ہر ایک کا نام لے کے سلام کا جواب دیتے تھے۔ بیبا جان سلام۔ رسولن سلام۔

ہر سلام کے بعد فدوی میاں مزاج پرسی کو بھی واجب سمجھتے تھے، اور ہر شخص کے ساتھ طرز پرسش میں جدت ہوتی تھی۔

گاڑی اس مکان تک پہنچی جسے دیکھنا منظور تھا۔ واقعی مکان قابل رہنے کے تھا۔ زنانہ مکان پختہ دو منزلہ باہر بیٹھنے کا مکان جسے قصباتی زبان میں بیٹھکہ (بہ تشدید قاف) کہتے ہیں۔ نہایت ہی معقول۔ اور اس کے سامنے بڑا سا احاطہ تھا۔ اس میں ایک طرف کچی کھپریلیں تھیں۔ گاڑی، گھوڑے اور سائیس، خدمت گار وغیرہ کے رہنے کے لیے جا بجا کچھ درخت مختلف قسم کے لگے ہوئے تھے۔ مگر بہت ہی بے تکے پن سے۔ کچھ بیلا چنبیلی کے جھنڈ۔ کچھ مہندی کی روشیں۔ بانس کا پھاٹک لگا تھا۔ غرض کہ مکان مرزا صاحب کے پسند آیا۔ شیورتن بھی اس موقع پر پہنچ گیا تھا ایک سیاہ فام سا آدمی، دھوتی بندھی ہوئی۔ اودی چھینٹ کی مرزئی پہنے۔ اُسی چھینٹ کی دوہری ٹوپی۔ پاؤں میں چمڑ دھا جوتا۔ گلے میں ایک بٹوا پڑا ہوا۔ یہ آپ کا درباری لباس تھا کیوں کہ اس وقت آپ براہ راست کچہری سے تشریف لائے تھے۔ تھانہ دار صاحب اور مرزا صاحب کے آنے کی خبر سن کے دوڑے چلے آئے شیورتن سے کرائے کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ اس موقع پر فدوی میاں ذرا ٹل گئے۔ سات روپیہ ماہوار پر وہ مکان لے لیا گیا اور اسی شب کو مرزا صاحب کا اسباب سفر وہاں آگیا۔

دو پلنگ، تین کرسیاں، فدوی میاں کی سرکار سے بلا طلب بھیج دی گئیں۔ اور طوعاً و کرہاً مرزا صاحب کو رکھنا پڑیں۔

دریاں اور قالین مرزا صاحب کے ہمراہ تھے۔ کھانا پکانے کے برتن بھی کافی موجود تھے۔ مکان کی صفائی اور مختصر سامان کی آراستگی میں فدوی میاں

کی دخل در معقولات ہوتی رہی۔ ایسے لوگ جو ہر کسی کام میں خواہ مخواہ دخیل ہو جاتے ہیں ان میں ایک خاص وصف ہوتا ہے جسے کسر نفس کے سوا اور کیا کہا جائے۔ یعنی اس قسم کے لوگوں کو دوسروں کی اختلاف رائے سے چنداں ملال بھی نہیں۔ اگرچہ وہ اختلاف برے تیوروں سے کیا جائے۔ مثلاً اگر ان کی یہ رائے ہوئی کہ دری اس طرح بچھانا چاہیے اور پلنگ یوں لگانا چاہیے اور میز کا رخ یوں رہے اور دیوار گیریوں کا وہ موقع ہے اور دوسرے شخص کی آسائش کا یہ اہتمام کر رہے ہیں۔ ان میں سے ہر تجویز کو بلا دلیل یا یہ الفاظ کہہ کے "صاحب آپ نہیں جانتے" مسترد کر دیا یا ہر ایک میں ترمیم کر دی۔ تو ان کو نہ کچھ خفت ہوگی نہ ملال۔ ایسے ہی ہمارے سادہ دل رئیس موضع سہجن پور فدوی میاں صاحب تھے۔

جب گھر کی صفائی اور آراستگی سے فراغت ہوئی اور ہر چیز اپنے اپنے موقع سے لگا دی گئی۔ فدوی میاں نے یہ فرمایا۔

لیجیے اُور سیر صاحب آپ کا مکان سج سجا گیا۔ اب اور جس چیز کی ضرورت ہو وہ بھی حاضر کر دی جائے۔ کیوں کہ خدا کے فضل سے سب کچھ ممکن ہے۔ فقط آپ کے اشارے کی دیر ہے۔

مرزا صاحب:۔ آپ کی عنایت کافی ہے۔ یہ سامان بھی میری ضرورتوں سے زیادہ ہے اور جو کچھ ضرورت ہوگی عرض کر دیا جائے گا۔ یہ آخری جملہ مرزا صاحب نے اس خیال سے کہا تھا کہ تھانہ دار صاحب نے پہلے ہی کہا تھا کہ گھوڑا فدوی میاں کی کوشش سے بہت جلد اور کفایت سے مل جائے گا مگر فدوی میاں کو سلسلۂ کلام کے طول دینے کا شوق تھا۔

فدوی میاں:۔ اے تو فرما دیجیے نا تاکہ اس کی ابھی سے فکر کی جائے مرزا کے پاس اتفاق سے روپیہ نہ تھا۔ ان کو یہ خیال ہوا کہ ابھی کہنا کیا ضرور ہے۔ پہلے روپے کی فکر ہو جائے تو دیکھا جائے گا۔

مرزا صاحب:۔ عرض کر دوں گا۔

فدوی میاں:۔ تو آپ فرماتے کیوں نہیں اور چارپائیوں کی ضرورت ہو تو بھجوا دی جائیں۔ چینی کے برتن، پتیلیاں، لوٹے، گھڑے، مٹکے غرض کہ

جس طرح لڑکے پہیلی بجھواتے ہیں یہ ایک ایک چیز کا نام لیے جاتے تھے اور مرزا نہیں نہیں کہتے جاتے تھے۔ ان کی سخاوت اور سفاہت پر اگر کوئی اور ہوتا تو کھل کھلا کے ہنس دیتا۔ مگر مرزا بہت ہی مہذب اور متین آدمی تھے۔ اس پر بھی متبسم ہو گئے۔ مرزا کے تبسم سے فدوی میاں لجوائے

ع۔ فکر ہر کس بہ قدر ہمت اوست

کچھ اور ہی سمجھتے تھے۔ مزاج کے سادے بے تکلف فرمانے لگے

فدوی میاں:۔ اچھا تو پھر اس میں تکلف کیا ہے۔ کوئی پتر یا بلا دی جائے کیوں کہ اس میں ہرج کیا ہے۔ آپ نوجوان آدمی ہیں اور پھر لکھنؤ کے رہنے والے۔ مرزا کے کان اس قسم کی گفتگو سے آشنا نہ تھے۔ یہ ایک خشک آدمی تھے۔

مرزا صاحب:۔ جناب آپ نے میرے اخلاق کا غلط اندازہ کیا۔ میں اس قسم کے مذاق کا آدمی نہیں۔ آپ کی خواہ مخواہ عنایتوں کا میں مجبوراً ممنون ہوں۔ آئندہ مجھ کو ایسے مذاق سے معاف رکھیے گا۔

فدوی میاں:۔ (بہ ظاہر جھینپ کے اور خجلت زدہ صورت بنا کے دو تین طمانچے زور زور سے اپنے گالوں پر لگا کے اور دونوں کان مروڑ کے) توبہ! توبہ! خطا ہوئی، معاف کیجیے گا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آپ مولوی آدمی ہیں۔

مرزا صاحب:۔ نہیں آپ کا کچھ قصور نہیں۔ یہ اس زمانے کی تہذیب کا قصور ہے۔ شاید آپ کو اسی طرح کے لوگوں سے زیادہ ملنے کا اتفاق ہوا ہوگا جو بیہودہ دل لگی مذاق یا چوسر، گنجفہ وغیرہ میں اپنے اوقات کو ضائع کیا کرتے ہیں۔ اگرچہ میں مولوی نہیں مگر طالب علم ضرور ہوں۔

مرزا اپنی نیک نفسی سے فدوی میاں کی اس بات کو دل لگی سمجھے تھے حالانکہ فدوی میاں کا مافی الضمیر حقیقت کا مشعر تھا۔ نہ مجاز کا۔ کیوں کہ آپ کی ذات والاصفات سے یہ فیض اکثر ملازم پیشہ لوگوں کو پہنچتا رہتا تھا۔ اتنا ہم اپنی نیک

نیتی سے کہہ سکتے ہیں کہ اس میں کوئی منفعت ذاتی از قسم زر فدوی میاں کو نہ تھی۔ بلکہ ان کا مذاقِ طبیعت اسی قسم کا واقع ہوا تھا۔ ضلع کی کون سی پتریا ایسی تھی جو آپ کی ممنونِ منت اور مطیع فرمان نہ ہو۔ ایک تو اس لیے کہ زمانۂ ثروت میں آپ نے بالتخصیص اس فرقے کے ساتھ بہت سلوک کیا تھا۔ اکثر باغات اور آراضی آپ کی عطیہ رنڈیوں کے قبضے میں موجود تھیں۔ چار ہی دن کا ذکر ہے چھوٹے صاحبزادے چھٹن میاں کی تقریب ختنہ میں دس بیگہ زمین بی دفاتن کو، بیس درخت آم کے مع آراضی بی رسولن کو دیے تھے۔ اسی تقریب میں موضع سہجن پور رہن ہوا تھا۔ یہ سب اوصاف فدوی میاں کے مرزا صاحب کو معلوم ہوتے رہے اور اسی قدر تنفر ان کے اخلاق سے بڑھتا گیا۔

اگرچہ گھوڑے کی خرید میں فدوی میاں کی رائے شریک رہی۔ اور اسی طرح اور معاملات میں خواہی نہ خواہی ان کا دخل رہا۔ لیکن مرزا ہر امر میں حتی الامکان ان سے دور بھاگتے تھے۔ لیکن فدوی میاں کی وضع داری سے بعید تھا کہ آپ مرزا صاحب کے پاس جانا ترک کرتے۔ بلکہ ان کو ایک طرح کی محبت مرزا سے ہو گئی تھی اور کچھ ایسا اخلاقی دباؤ پڑ گیا تھا کہ ان سے کسی قدر ڈرتے تھے۔

فدوی میاں کو کئی مرتبہ مرزا کے سامنے اپنے منہ پر طمانچے مارنے اور کان مروڑنے کا اتفاق ہوا۔ اس لیے کہ یہ موقع پر بول اٹھتے تھے اور جو امر مرزا کی شان کے خلاف ہوتا تھا اس پر ان کو ڈانٹتے رہتے تھے۔ مثلاً فدوی میاں کو یہ مسئلہ مرزا کی ذات سے تحقیق ہوا کہ وہ چیز جو عموماً بالائی آمدنی کہلاتی ہے اس کا لینا بالکل حرام ہے۔

فدوی میاں صوم وصلوٰۃ کی پابندی اور ناجائز کھانے پینے کی چیزوں سے اجتناب کرنے کو مولویت اور زہد و ورع خیال کرتے تھے۔ ناجائز طریقوں کے اکتساب منفعت کرنے کو یہ گناہ ہی نہ جانتے تھے بلکہ حرام سمجھتے تھے۔

مرزا عابد حسین سے ان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ شادی بیاہ میں ناچ رنگ یا

عید، بقر عید مجرا دیکھنا یا بغیر مجرا دیکھے پتریوں کو انعام دینا گناہ ہے۔ فدوی میاں کو مرزا عابد حسین کی صحبت سے اکثر ایسے امور معلوم ہوئے جن کو یہ نیکی سمجھتے تھے مگر درحقیقت وہ بدی ہے۔ رفتہ رفتہ فدوی میاں کو مرزا صاحب سے وہ اعتقاد ہو گیا جو مقلد کو اپنے مجتہد سے یا مرید کو اپنے پیر سے ہونا چاہیے۔ مگر فدوی میاں کی عادتیں اس حد تک خراب ہو چکی تھیں کہ ان کی اصلاح محال تھی۔ اہل عملہ کی خوشامد بیجا، سعی و سفارش، جھوٹ بولنا جھوٹی قسمیں کھانا، فحش اور بے تکا مذاق، راتوں کو رنڈیوں کا دربار، جھوٹے مقدموں کی اطاعت، بدمعاشوں کی حمایت اور اسی قسم کے لاکھوں معائب ان میں موجود تھے۔ مگر ان سب معائب کے ساتھ ایک وصف بھی تھا وہ یہ کہ خاندانی شرافت نفس کی وجہ سے طمع ان میں نہ تھی۔ اگرچہ اس وصف کے ساتھ ایک عیب بھی تھا یعنی اسراف جس کو لوگ جہالت سے اولوالعزمی کہتے ہیں۔ مرزا صاحب ان کے اس وصف کو پہچان گئے تھے۔ مرزا کا خیال تھا کہ ان کی یہ عادتیں کسی حد تک ترک ہو سکتی ہیں بشرطیکہ کسی خاص اخلاقی قوت سے ان کے نفس پر اثر ڈالا جائے۔ مرزا نے تجویز کیا کہ مذہبی جوش اگر آپ کی طبیعت میں پیدا کر دیا جائے تو ممکن ہے کہ ان کی اولوالعزمی ان کو اس طرف متوجہ کر دے۔

فدوی میاں کے دو لڑکے تھے۔ ایک نثار علی جس کا سن چودہ برس کا تھا۔ دوسرا احمد حسن جس کا سن سات آٹھ برس کا تھا۔

نثار علی آوارگی کی حد تک پہنچ گیا۔ مگر ایک خاص صفت جو قصبات اور دیہات کے لڑکوں میں پائی جاتی ہے، یعنی شرم۔ اگرچہ وہ حدِ اعتدال سے کسی قدر زیادہ ہوتی ہے لیکن وہی ان کی درستی کا باعث ہوئی۔

فدوی میاں اپنے لڑکوں کی تعلیم سے غافل نہ تھے۔ ایک مولوی صاحب برسوں سے دروازے پر نوکر تھے۔ مگر لڑکا گلستاں کا بابِ اوّل پڑھتا تھا۔ کئی سال ہو چکے تھے مگر اُس کے ختم ہونے کی نوبت نہ آتی تھی۔ اور چھوٹا بغدادی

قاعدہ سامنے لیے بیٹھا رہتا تھا۔ مرزا صاحب نے رفتہ رفتہ فدوی میاں کے معاملات خانگی میں دخل دینا شروع کیا۔ اور جس قدر مرزا صاحب ان کے معاملات میں دخیل ہوتے جاتے تھے۔ فدوی میاں اپنی ذمہ داریاں مرزا کے سپرد کرتے جاتے تھے نوبت بہ ایں جا رسید کہ فدوی میاں کا ہر کام مرزا نے اپنے ذمہ لے لیا۔ فدوی میاں کی وہ اس طرح محافظت اور نگرانی کرتے تھے جو نابالغ یا مجنون کے ولی کو کرنا چاہیے۔ اور فدوی میاں روز اول سے کچھ ایسا دبا دُ مرزا صاحب کا مان گئے تھے کہ بغیر ان کی صواب دید کے کوئی کام نہ ہوتا تھا۔ جس قدر مرزا صاحب فدوی میاں پر توجہ کرتے جاتے تھے شیورتن کو مرزا صاحب سے خوف پیدا ہوتا جاتا تھا مرزا صاحب کو فدوی میاں اور شیورتن کے معاملات میں کچھ گنجلک اور غبن معلوم ہوئی اور درحقیقت ایسا ہی تھا۔ مرزا صاحب خود فرماتے ہیں کہ یہ راز مجھ پر شیورتن کی چشم ابرو سے ظاہر ہو گیا تھا۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے شیورتن کی نگاہیں فدوی میاں کے سامنے جھینپتی سی معلوم ہوتی تھیں۔ اس سے مجھے معلوم ہو گیا کہ اس نے کسی قسم کی چالاکی ان کے معاملات میں ضرور کی ہے اور وہ فدوی میاں سے کسی قدر دبتا بھی تھا۔ اس سے اور بھی یقین ہو گیا تھا کہ ابھی تک اُس کی چالاکی کا تدارک فدوی میاں کے اختیار میں ہے۔

فدوی میاں کا اہل عملہ کے پاس دوڑ دوڑ کے جانا۔ اس سے بھی مجھے ایک قسم کا شبہہ سا پیدا ہوتا تھا کہ شاید فدوی میاں ان معاملات کے تدارک کی فکر میں ہیں۔ مگر ان کی بے پروائی نے اس شبہہ کو دفع کر دیا تھا۔

مرزا صاحب فدوی میاں کو خفیف العقل سمجھتے تھے۔ اس لیے اپنے خیالات کو ان سے ظاہر کرنے میں انھیں تامل تھا۔ اس لیے کہ شاید وہ اس راز کو ظاہر کر دیں کہ مرزا کو ان کے معاملات کی درستی کی غیر معمولی فکر ہے۔ ان امور پر نظر کر کے مرزا نے خفیہ تحقیقات کرنا شروع۔ شیورتن ایک بڈھا آدمی تھا۔ وہ فدوی میاں کے والد کے زمانے میں اُن کے کسی موضع کا ضلع دار تھا۔

جس زمانے میں فدوی میاں کے والد شیخ قربان محمد صاحب نے انتقال کیا۔ فدوی میاں جن کا اصلی نام شیخ فدا علی تھا، بہت ہی کم سن تھے۔ تولیت جائداد کی ان کے ماموں شیخ احمد کے سپرد ہوئی تھی۔ شیخ احمد ایک مشہور جعلیہ تھا۔ شیخ احمد کی تولیت کے زمانے میں بھی شیورتن کارکن رہا۔ بعد تحقیقات کے معلوم ہوا کہ شیخ احمد اور شیورتن کی سازش سے اس معاملے میں کوئی جعل ہوا ہے مگر یہ پتہ نہ لگتا تھا کہ کیوں کر اور کیا جعل ہوا ہے۔ مرزا کا خود بیان ہے کہ اس مقدمے کی تحقیقات کا مجھے ایسا شوق ہو گیا تھا کہ راتوں کو نیند نہ آتی تھی۔ ذرا ذرا سی باتوں کو عملی مشاہدات کے طور پر جانچتا اور پرتالتا تھا۔ شیورتن کے تمام حرکات و سکنات پر شب و روز میری نظر رہتی تھی۔ اگرچہ اس سے مہینہ میں شاید ہی دو ایک مرتبہ میرے اُن کے ملاقات ہوتی تھی۔ وہ بھی چند منٹ کے لیے۔ مگر میرا خیال ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا۔ فدوی میاں اگرچہ بہت ہی سفیہ اور خفیف الحرکات آدمی تھے مگر اپنی آبائی جائداد کو اپنے والد کے ایک ادنیٰ ملازم کے قبضے میں دیکھ کر ایک قسم کی حسرت جو اُس کے بشرے پر ظاہر ہوتی تھی اُس پر مجھے کمال تاسف ہوتا تھا اور جب سے میں یہ سمجھ گیا تھا کہ اس مقدمے میں شیورتن نے یقیناً جعل کیا ہے۔ اُس وقت سے میرا بس نہ تھا کہ اس کو علاقے سے بے دخل کر کے فدوی میاں کو اس کی جگہ قابض کرا دوں مگر میرا کوئی اختیار نہ تھا۔ ظاہرا یہ امر محال معلوم ہوتا تھا اور سب سے زیادہ اہم ان خیالات کی رازداری تھی۔ اس لیے کہ افشائے راز میں ناکامیابی کا اندیشہ ایک طرف، شماتت کا خیال دوسری طرف دامن گیر حال تھا۔ آخر بڑی مشکل سے بعض واقعات کا پتہ لگا۔ پھر تو پیچ در پیچ مشکلیں آسان ہونے لگیں اور برسوں کی اُلجھی ہوئی گتھیاں سلجھ گئیں۔

معلوم ہوا کہ شیخ قربان علی فدوی میاں کے والد نے لکھنؤ میں وفات پائی تھی۔ سبب وفات مرض وبائی مشہور تھا۔ شیخ فدا علی کی والدہ اپنے شوہر کے سامنے مر چکی تھیں۔ شیخ احمد ان کا سوتیلا بھائی تھا۔

شیخ قربان علی کے لکھنؤ جانے کا سبب ایک مقدمہ اپیل تھا۔ مقدمہ کی روداد یہ تھی کہ کسی راجپوت مسمّٰی ماندھاتا نے بندوبست کے زمانے میں شیخ قربان علی کے علاقے پر دعویٰ کیا تھا۔ سرسری مقدمہ حاکم بندوبست نے خارج کر دیا۔ اُس نے نمبری نالش کی۔ وہ بھی خارج ہوئی۔ پھر اُس نے اپیل کی۔ اپیل بھی خارج ہوئی۔ پھر اُس نے اپیل ثانی کی۔ یہاں وہ تمام لوگوں کے خلافِ اُمید جیت گیا۔ جس دن عدالت العالیہ سے مقدمہ اُس کے حق میں فیصلہ ہوا۔ وہی دن شیخ قربان علی کی وفات کا تھا۔ بلکہ اکثر لوگوں کو یہ گمان ہوا کہ شیخ خودکشی کر کے مر گئے۔ اپیل سے جیتنے کے بعد چاہیے تھا کہ قابض جائداد ماندھاتا یا اُس کے وارث ہوتے مگر بخلاف اس کے قابض جائداد شیخ احمد اور شیو رتن ہوئے۔ شیخ احمد لاوارث مر گیا۔ اس کے بعد شیو رتن بلا مزاحمت احدے اور بے شراکت غیرے تمام علاقے پر قابض اور متصرف رہا۔ فدوی میاں کے ساتھ اُس کا سلوک اس طرح کا ہے جیسے کسی نمک حلال قدیم نوکر کو جو کسی وقت میں ملازم تھا اپنے آقا زادہ کے ساتھ ہونا چاہیے جو اب مفلس ہو۔ مگر اس سلوک میں ظاہر داری کسی نہ کسی طرح کھل جاتی تھی۔ جائداد پدری سے ایک بسوہ زمین شیخ فدا علی کو نہیں ملی۔ موضع سہجن پور۔ جس کا نمبر اب تک اس کے پاس ہے اور جو شیو رتن کے پاس کئی سال پیشتر رہن ہو چکا ہے وہ موضع ان کی والدہ کا تھا۔ کُل جائداد کا مالک بالفعل شیو رتن تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ حتیٰ کہ مکانات بھی اُس کے نام رہن ہیں۔ مگر وہ بطور مایحتاج شیخ فدا علی کو گزارہ دیتا ہے۔ اور موضع سہجن پور کے اسامیوں سے جو کچھ چھین جھپٹ کے وصول ہو جاتا ہے وہ گویا بالائی آمدنی ہمارے عنایت فرما شیخ فدا علی صاحب کی ہے۔ مرزا کو یہ واقعات جو اوپر بیان کیے کئی برس کی تحقیق کے بعد معلوم ہوئے۔ یہ تو اُن پر ظاہر ہو گیا تھا کہ اس معاملے میں کسی قسم کی چالاکی ہوئی ہے۔ رہا یہ امر کہ وہ قابلِ تدارک ہے یا نہیں اس کا فیصلہ تفصیلی حالات کے معلوم ہونے کے بعد

ہو سکتا ہے۔ منھ سے کوئی بات نکالنا ایک تو اس مقدمے کے لیے مضر تھا۔ جس کا سبب اوپر بیان ہوا اور مرزا کا استقلال بھی اس کا مقتضی تھا کہ جب تک کوئی صورت یقینی کامیابی کی نہ پیدا ہو ایسی باتوں کا منھ سے نکالنا سفاہت پر محمول کیا جائے گا۔ ان کا یہ منصوبہ تھا۔ کیا خوب ہو۔ اگر میں اس معاملے کا پورا پتہ لگا کے اور تدارک کی کافی تدبیر کر کے اس کو زبان سے نکالوں۔ پانچ برس تک اس معاملے سے مرزا کو تعلق خاطر رہا۔ فدوی میاں تو روز ہی مرزا کے پاس موجود رہتے تھے اور شیو رتن بھی کبھی کبھی آنکلتا تھا۔ مگر دونوں کو ان کے کسی اشارے کنائے سے یہ نہ ثابت ہوا کہ وہ ان کے حق میں کیا کرنے والے ہیں۔ اس اثنا میں کئی بار ان کو لکھنؤ آنے کا اتفاق ہوا۔ جو ڈیشلی کے محافظ خانے میں دن دن بھر گزر گیا۔ کُل مقدمہ کی روداد سے انھوں نے واقفیت حاصل کر لی۔

جب تحقیقات کما حقہ کر چکے تو اس راز کو ایک خاص مطلب کے لیے راقم الحروف (مرزا رسوا) پر ظاہر کیا۔ اور بعض امور مجھ کو تعلیم کیے جس کا حال ناظرین کو آئندہ بیان سے معلوم ہو جائے گا۔ اس مطلب کے لیے مجھ کو مرزا کے پاس ضلع ..... جانا پڑا۔ اتوار کا دن تھا۔ مرزا دیوان خانہ (بیٹھک) میں تشریف رکھتے ہیں۔ فدوی میاں اور مجھ سے مذاق کی بات ہو رہی ہیں کہ مرزا نے اپنے اردلی کے چپراسی کو بلا کے کہا۔ شیو رتن کو بلا لاؤ۔ شاید اس سے پہلے مرزا نے کسی موقع پر شیو رتن کو یاد نہ کیا ہوگا۔ میں تو اس معاملے سے واقف تھا۔ مگر فدوی میاں کو البتہ تعجب ہوا ہوگا کہ آج شیو رتن خلاف معمول کیوں بلایا جاتا ہے۔

شیو رتن حسب الطلب سامنے آ کے کھڑا ہوا۔ مرزا نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ مرزا نے اس سے چند معمولی غیر ضروری باتیں کر کے مجھ سے مخاطب ہو کے پوچھا۔

مرزا:۔ ہاں تو ولایت علی خاں مرگیا۔
میں نہیں بیان کرسکتا کہ اس نام کے سننے کے بعد شیورتن کے دل پر کیا گزری اور اس کے چشم و ابرو سے کس قسم کے آثار پائے گئے۔
میں:۔ جی ہاں مرگیا۔ اس کو مرے ہوئے دو مہینے ہوئے ہوں گے۔
مرزا:۔ آپ جانتے ہیں یہ کون شخص تھا۔
رسوا:۔ میں خوب جانتا ہوں۔ کٹاری ٹولہ کے متصل وہ گلی جو کالکوں کی طرف جاتی ہے۔ نیم کے درخت کے سامنے۔
مرزا:۔ آپ خوب جانتے ہوں۔ مگر آپ نے سنا ہوگا کس بری گت سے مرا ہے۔
رسوا:۔ جی ہاں بندگان خدا کی حق تلفی کا یہی انجام ہوتا ہے۔
مرزا:۔ سنتے ہیں لاوارث تھا۔ مرنے کے بعد کُل اسباب پولیس میں اٹھ گیا ہوگا اور یقین ہے کہ پولیس ہی نے اسے دفن کیا ہو۔
رسوا:۔ جی ہاں یہی ہوا۔ اور ہونا ہی کیا تھا۔
مرزا:۔ اور وہ تکیہ جو اس کے سرہانے رہتا تھا۔
رسوا:۔ اس کا حال پھر عرض کروں گا۔
اس گفتگو کے بعد ہم اور مرزا ادھر ادھر کا ذکر کرنے لگے۔ شیورتن کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ابھی اُٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ مرزا نے گاڑی کسوانے کا حکم دیا۔ مرزا صاحب اور میں دونوں اٹھ کھڑے ہوئے مرزا صاحب نے فدوی میاں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گاڑی پر سوار ہوئے۔ راستہ میں سوائے اس جملہ کے جو مجھ سے مخاطب ہو کے کہا تھا
"کیوں دیکھا آپ نے ہم نہ کہتے تھے"۔ جس کا میں نے یہ جواب عرض کیا تھا۔ جی ہاں آپ کا خیال بہت صحیح تھا۔ اور کوئی گفتگو اس مقدمہ کی نہیں ہوئی۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ شیورتن رات ہی کو لکھنؤ گیا۔
اس واقعے سے ہمارے خیالات اور پختہ ہوگئے۔ کئی دن کے بعد لکھنؤ

سے واپس آیا۔

مرزا کا موکل شکرم میں شیورتن کے ساتھ ساتھ تھا۔ شکرم لکھنؤ پہنچی۔ موکل ساتھ تھا، شیورتن امین آباد کی سرا میں اترا۔ وہاں تھوڑی دیر ٹھہر کے چوک کی طرف روانہ ہوا۔ گول دروازے کے قریب بان والی گلی کی طرف سے ولایت علی خاں کے مکان پر پہنچا (جس دُکان میں ولایت علی خاں رہتا تھا وہاں اب شیوالہ بن گیا ہے) شیورتن وہاں کے دُکان داروں سے کچھ پتہ دریافت کرکے اس چھتہ کی طرف چلا۔ جہاں تیرہ و تاریک گلیاں بہت دور تک چلی گئی ہیں۔ اس کے بعد ایک نالہ ملتا ہے۔ پھر ایک ٹیکرا سا ملا۔ اس پر گیا۔ وہاں ایک شخص کو آواز دی وہ گھر سے نکلا۔ دونوں میں کچھ باتیں ہوئیں۔ ولایت علی خاں کو مرے ہوئے دوسرا مہینہ تھا۔ یہ ٹھیک پولیس کی معرفت دفن ہوا تھا مگر تکیہ کا پتہ نہ ملا۔ اس کے بعد موکل اور شیورتن دونوں امین آباد کی سرا میں آئے۔ انھوں نے حلوائی کی دکان سے پوریاں لے کے کھائیں۔ موکل نے بھی اسی حلوائی سے پوریاں لیں۔ اس کے بعد شیورتن نظیر آباد کی طرف۔ اس کے بعد اس نے دو دن تک کچہریوں کی خاک چھانی۔ آخر مایوس ہوکر ..... ضلع کو واپس چلا گیا۔ موکل اس سے ایک دن پہلے ہمارے پاس پہنچ گیا تھا۔

وہ تکیہ جس میں شیورتن کی جان تھی ہمارے قبضے میں کئی مہینے پیشتر آچکا تھا۔ اس میں چند کاغذات تھے اور وہ کاغذات سب فدوی میاں کے علاقے کے متعلق تھے۔

اب ہم اس جعل سازی کو کھولے دیتے ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہوا کہ باندھا تا عدالت العالیہ سے مقدمہ ہار گیا تھا۔ جیسی کہ توقع تھی۔ مگر اُسی کے دوسرے یا تیسرے دن شیخ قربان علی نے بہ عارضۂ فصلی بخار انتقال کیا جیسا کہ ظاہراً ثابت ہوتا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ شیورتن اور شیخ احمد بو

شیخ مرحوم کے ہمراہ تھے، اِن دونوں نے سازش کر کے شیخ کو کچھ کھلا پلا دیا ہو۔ مگر اس قدر عرصے کی بات تھی۔ اس کا ثبوت دشوار بلکہ محال ہے۔ علاقے کے باب میں یہ چالاکی کی گئی کہ اصلی فیصلہ محافظ خانہ سے اڑوا کے اور بجائے اُس کے ایک فیصلہ بحق ماندھاتا ولایت علی خاں کی معرفت بنوالیا گیا۔ پھر ماندھاتا اور شیخ احمد اور شیورتن میں کچھ ایسا من سمجھوتا ہو گیا کہ ماندھاتا کچھ رقم معتدبہ لے کے علیحدہ ہو گیا۔ اور اس سے ایک رہن نامہ بنام شیورتن ہو گیا۔ شیخ احمد کے نام رہن نامہ ہوتا مگر اس کی حیثیت اس لائق نہ تھی۔ اور شیورتن شیخ قربان احمد کے زمانہ ہی میں لین دین کرتا تھا اور بڑا روپیہ والا مشہور تھا اصل فیصلہ عدالت جو ولایت علی خاں کو بطور نمونے کے دیا گیا تھا وہ اس نے دبا رکھا۔ اور اس کے ذریعے سے وہ شیورتن کو وقتاً فوقتاً دبا کر کچھ لے لیا کرتا تھا۔

آخر میں ولایت علی خاں نابینا ہو گیا تھا۔ جب وہ خرچ سے تنگ ہوتا تو ایک خط دباؤ ڈالنے کے لیے شیورتن کو لکھ بھیجتا۔ وہ کچھ نہ کچھ بھیج دیا کرتا تھا۔ مگر قلیل مقدار۔ اس لیے کہ شیورتن خوب جانتا تھا کہ ولایت علی وہ کاغذات پولیس یا عدالت میں داخل نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ وہ خود مجرم ہے مگر پھر بھی احتیاطاً کچھ دے نکلتا تھا۔ جب مرزا اس مقدمے کی تحقیقات میں مصروف ہوئے۔ ایک دن شیورتن کے نام کا ایک پوسٹ کارڈ مرزا کی ڈاک کے ساتھ چلا آیا۔ اس پوسٹ کارڈ میں اگرچہ کوئی امر تفصیلی طور سے نہ لکھا تھا مگر ولایت علی خاں کو مرزا اچھی طرح جانتے تھے۔ ولایت علی خاں کا نام پوسٹ کارڈ پر دیکھتے ہی گویا تمام مقدمہ کا پتہ چل گیا۔

پوسٹ کارڈ کا مضمون یہ تھا کہ شیورتن کو معلوم ہو کہ ہمارا آخری وقت ہے۔ کچھ ہماری مدد کرنا چاہیے۔ کاغذات ہم سے لے لو۔ اور جو کچھ تم سے ہو سکے ہم کو دے دینا۔ ورنہ مرتا کیا نہ کرتا۔

اس پوسٹ کارڈ کو مرزا نے دبا رکھا۔ اور ایک موکل شیورتن کی طرف سے ولایت علی خاں کے پاس گیا اور پچاس روپیہ دے کے وہ کاغذات اس سے حاصل کر لیے۔ اس کے چند ہی روز بعد ولایت علی واصل جہنم ہوا۔ واقعی بہت بُری طرح سے مرا۔ جعلیے بے ایمانوں کا ایسا ہی انجام ہونا چاہیے۔

ان واقعات کے مفصل ذکر کرنے کے بعد اب اس کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ شیورتن کس قدر سہولیت کے ساتھ تمام جائداد سے دست بردار ہونے پر راضی ہو گیا ہو گا۔ باہمی فیصلہ کر لینا مناسب وقت تھا۔ اس لیے کہ اگرچہ جعل کا ثبوت قطعی ہاتھ آ گیا تھا اور شیورتن واقعی مجرم تھا۔ اس لیے وہ بہت ہی خائف تھا۔ مگر بہت عرصے کی بات تھی۔ اس لیے مرزا کی احتیاط اِسی کی مقتضی ہوئی کہ یہ مقدمہ عدالت تک نہ جائے اور شیورتن بھی یہی چاہتا تھا۔ لہٰذا شیورتن نے کُل جائداد کا بیع نامہ فدوی میاں کے نام کر کے صرف ایک موضع اپنے نام چھوڑ دالیا اور اس فیصلے کے چند ہی روز کے بعد تیرتھ کو چلا گیا۔ جہاں سے اس وقت تک واپس نہیں آیا۔

اب فدوی میاں کا حال نہ پوچھیے پورے رئیس بن گئے۔ مگر مرزا کو ابھی تک اُسی طرح مانے جاتے ہیں اور کوئی کام بغیر ان کی صلاح مشورے کے نہیں کرتے۔

اقتباس

ذات شریف

دیباچہ

قصہ کہانیوں کے لکھنے والے بھی ایک قسم کے مورخ ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کی لکھی ہوئی تاریخ یعنی ان کا لکھا ہوا قصہ اُس واقعہ نویسی سے جسے تاریخ کہتے ہیں ایک حیثیت سے زیادہ تر قابل لحاظ اور قدر کے لائق ہے۔ اس لیے کہ تاریخ نویس خاص شخصوں کے اخلاقی یا تمدنی حالات سے بحث کیا کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک شخص کی سیرت میں باعتبار کسی خصوصیت کے کوئی مادہ یا قوت حد اعتدال سے کم یا زیادہ ہو لہذا اُس شخص واحد کے واقعات اور حالات میں عمومیت نہیں۔ قصہ کہانی کی کتابیں لکھنے والوں کو کسی خاص شخص کی سیرت سے کوئی سروکار نہیں اس وجہ سے ذاتی اغراض کو بھی اُس سے کوئی تعلق نہیں۔ تاریخ کی کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ بعض اوقات ایک ہی شخص کے واقعات جنھیں دو مورخوں نے لکھا ہے بالکل ایک دوسرے کے ضد ہیں۔ مثلاً ایک مورخ تیمور کو حد کا نیک اور عادل اور دوسرا سخت شریر اور ظالم لکھتا ہے۔ اس صورت میں اصل حقیقت کا معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ناول نویس ان واقعات کو علی العموم تحریر کر دیتا ہے جو اس نے اپنے زمانے میں دیکھے ہیں۔ یا اسے دوسری عبارت میں یوں کہیے کہ زمانہ کی تصویریں جو اس کے دل و دماغ کے مرقع میں موجود ہیں۔ ان ہی کی نقلیں اتار اتار کے ناظرین کو دکھا دیتا

ہے مگر یہ ان ناول نویسوں کا ذکر ہے جنھوں نے اس فن خاص میں صرف فطرت کو اپنا معلم بنا لیا ہے جو ناول نویس اس باریکی کو نہیں سمجھے وہ اکثر دھوکہ کھاتے ہیں۔

کسی قصہ کو دل چسپ بنانے کے لیے اصل حقیقت سے دور ہو جانا ایک ایسی غلطی ہے جس سے لکھنے والے کے مذاق کی قلعی کھل جاتی ہے۔ فطرت میں جو چیزیں پائی جاتی ہیں ان سے بہتر مثالیں ہم کو مل ہی نہیں سکتیں۔ مثلاً طرح طرح کے پھول جو باغوں میں کھلتے ہیں ان ہی کی نقاشی سے نقاش کامیاب ہو سکتا ہے۔ بھلا کوئی پھول کوئی اپنی طبیعت سے ایجاد کر کے اس کی صورت ہمیں بنا کے دکھائے تو ہم جانیں۔

ارسطالیس حکیم نے کیا خوب بات کہی تھی کہ شاعری ایک قسم کی نقال ہے۔ پھر اگر نقال ہے تو کس کی اُسی فطرت کی۔

اس کو سمجھ کے ہم نے اپنی تحریر کا یہی اصول قرار دیا ہے کہ جو چیزیں ہماری نظر سے گزر گئی ہیں اور ان سے ہماری طبیعت خود متاثر ہوئی ہے اسی کو ناول میں لکھ دیتے ہیں۔

انسانی طبیعتیں ایک حد خاص تک ایک ہی طرح کی ہوتی ہیں۔ جن چیزوں نے ہم پر اثر کیا ہے ہمیں یقین ہے کہ وہ دوسروں پر بھی اثر کریں بعض معاصرین کا یہ طریقہ ہے کہ وہ کسی امر خاص کے ثابت کرنے کے لیے پلاٹ (قصہ کا منصوبہ) بناتے ہیں اور اسی کی مناسبت سے خانہ پری کر دیتے ہیں۔

ہم ان پر اعتراض نہیں کرتے مگر اتنا کہہ دینا کوئی قصور نہیں کہ ہمارا طرز تحریر اس کے برعکس ہے ہم صرف اصل واقعے کو ہو بہو دکھانا چاہتے ہیں۔ اور اس سے جو کچھ نتائج پیدا ہوں اس کی تحریر سے ہم کو مطلب نہیں۔

ہمارے اکثر ناولوں کا موقع واردات ہمارا وطن خاص یعنی لکھنؤ ہے۔ اس بات خاص میں ہم کو اُن ناظرین سے جو لکھنؤ کے رہنے والے نہیں۔ معذرت کرنا چاہیے۔ لہذا بر سبیل معذرت ہم اپنے عدم استعداد کا اعتراف کرتے ہیں۔ مگر

اس میں ہم نے اپنے بچاؤ کی ایک صورت نکالی ہے۔ جس کی تمہید اس کے قبل ہو چکی۔ مزید توضیح یہ ہے کہ ہمارے تخئیل اس قدر وسیع نہیں کہ ہزاروں برس پہلے کے واقعات کے نقشے دکھا سکیں اور اس کے ساتھ ہی ہم اسے بھی معیوب جانتے ہیں کہ اگلے پچھلے واقعات میں غلط مبحث کر کے ایک نئی چیز پیدا کریں جو نہ اس زمانے کے موافق ہو اور نہ اس زمانے کے مطابق اگر غور سے دیکھیے گا تو اکثر ایسا ہو جایا کرتا ہے۔ تاریخی ناول لکھنا بڑی لیاقت اور محنت کا کام ہے۔ نہ ہمیں اتنی لیاقت نہ فرصت۔ یہ دو ناول یعنی ذات شریف اور شریف زادہ جو فی الحال ہدیہ ناظرین کیے جاتے ہیں ان کے ناموں سے ظاہر ہے کہ یہ ایک دوسرے کے متقابل ہیں ایک میں اعلیٰ درجے سے ادنیٰ کی طرف تنزل اور دوسرے میں اس کے برعکس۔ ادنیٰ درجے کے تنزل سے اعلیٰ درجے کی ترقی کا فسانہ ہے۔

لکھنؤ کا درجہ شہرت کے اعتبار سے ہندوستان میں چوتھا یا پانچواں ہے اور بعض خصوصیتوں کے لحاظ سے اس خطے میں کچھ ایسے امور جمع ہو گئے ہیں جو اور شہروں میں کمتر پائے جاتے ہیں۔ یہ شہر جامعہ اضداد ہے۔

بہت اچھے۔ بہت برے۔ حد کے شریف۔ حد کے پاجی۔ بڑے ایمان دار۔ پکے بے ایمان۔ غرض کہ اخلاقی صفتوں کی افراط و تفریط جیسی اس شہر میں ہے اور کہیں کم ہوگی۔ اکثر تجربہ کار لوگوں کا مقولہ ہے (ان میں وہ لوگ ہیں جو اس شہر کے باشندے نہیں) کہ ترقی اور تنزل کے مادے جیسے اس شہر میں فراہم ہیں ہندوستان میں اس کی نظیر اور کہیں نہیں پائی جاتی۔ یہ شہر بہت کچھ ترقی کرتا۔ مگر یہاں کے رہنے والوں میں ایک بیہودہ نخوت اس قسم کی پائی جاتی ہے جس کا نتیجہ سوائے تنزل کے اور کچھ نہیں ہو سکتا یہ نخوت جہل مرکب کے آثار رویہ میں سے ہے اس میں شک نہیں کہ یہاں کے رہنے والے کسی قدر آراستہ اور تیز فہم ہیں۔ مگر خدا جانے یہ خیال کیوں کر دماغوں میں سما گیا ہے کہ ہم بڑے ذی فہم۔ بڑے تمیز دار۔ بہت عاقل۔ بڑے دور اندیش ہیں۔ اس وقت اس کی فرصت نہیں کہ ہم اس

خرابی کے وجوہ اور اسباب کو بیان کریں اور نہ ایک ناول کے دیباچے میں ایسی بحثوں کی گنجائش ہے۔ مگر واقعات کے سمجھانے کے لیے صرف موجودہ حالت کا ذکر بے موقع نہیں۔ گویا کہ یہ چند کلمے اس بے سروپا افسانے کی طلسم کی کنجی ہے۔

اس شہر میں کسی نئی بات کا رواج مشکل سے ہوسکتا ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ یہ شہر ایک مدت تک دارالعلم رہا ہے۔ پرانے خیالات دلوں میں ایسے راسخ ہوگئے ہیں کہ ان کا دماغوں سے نکلنا سخت دشوار ہے۔ مثلاً اب تمام عالم حرکتِ ارض کا قائل ہے۔ مگر یہاں ہر گلی کوچے میں ایسے کٹ ملا مل جائیں گے جو ابطال حرکتِ ارض پر بحث کرنے بیٹھیں تو دماغ پریشان کر دیں۔ کیمیاگری کے فن کو اب دنیا لغو سمجھتی ہے۔ یہاں ہر محلے میں دو تین کیمیاگر مل سکتے ہیں۔ جن کو اپنے بنائے ہوئے سونے میں ایک آنچ کی کسر کا بھی شبہ نہیں ہے منوں خیالی سونا روز بنتا ہے اور بک جاتا ہے۔ گو کہ وصول کچھ نہ ہو۔ جن و پری کی تسخیر کا شوق تیس چالیس برس پہلے بہت تھا۔ اب ایسے لوگ کم ہیں۔ مگر پھر بھی بہ نسبت اور شہروں کے بہت ہیں۔ لکھنؤ کی زبان تمام ملک میں مشہور ہے۔ اس شہر میں خاندانی علم و فن بہت پوچھا جاتا ہے۔ خاندانی عالم۔ خاندانی حکیم۔ خاندانی شاعر۔ خاندانی مصور۔ غرض کہ ہر علم و فن ایک خاندان خاص کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور یہ باطل عقیدہ اس قدر مضبوط اور مستحکم ہے کہ اس نے علم و فن کو اس شہر سے مٹا دیا۔ وہ اس طرح کہ کوئی شخص کسی علم یا فن کا کامل برآمد روزگار کیوں نہ ہو۔ اگر اس کے آبا و اجداد مشاہیر میں سے نہ تھے تو اس کی قدردانی تعلیم توقیر سب ندارد فلاں ابن فلاں ہونا یہاں ضروریات سے ہے۔ ورنہ اگر وہ افلاطون وقت بھی ہو تو کوئی اس کو نہ پوچھے گا۔ اب ان خاندانوں کا حال سنیے جن میں کبھی علم و فن تھا۔ یعنی وہ لوگ جن کے اسلاف مشاہیر میں سے تھے بس یہی آبائی فضیلت تاقیامت خاندانی فخر کے لیے کافی ہے کچھ ضرورت نہیں کہ خود بھی کوئی لیاقت پیدا کریں اس لیے علم رفتہ رفتہ ان خاندانوں سے بھی کافور

ہو گیا اور یہ بلا کم و بیش تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے مگر اس شہر میں سب سے زیادہ۔ خیالات کی آزادی اور علم کی ترقی کے اسباب زمانے نے فراہم کر دیے۔ مگر یہاں اس کا کوئی اثر محسوس نہیں ہو سکتا۔ کوئی کتاب لکھیے۔ کوئی اخبار نکالیے اس شہر میں اس کا کوئی پوچھنے والا نہ نکلے گا۔ اس لیے کہ یہ خیال دلوں میں سمایا ہوا ہے کہ ہم سب کچھ جانتے ہیں پھر ہمیں کچھ لکھنے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگلی فلسفہ جن کو اصول علوم سمجھنا چاہیے۔ یہاں کے پڑھے لکھے لوگوں کے دماغوں میں پوری تاثیر کر چکا ہے۔ از بسکہ اصول ایک صورت سے جمیع فروع پر سادی ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ خیال پیدا ہو جانا کوئی عجب نہیں ہے کہ ہم سب کچھ جانتے ہیں۔ حکمت کے تجربے کی ایک شعاع بھی ابھی یہاں نہیں پہنچی۔

پرانے خیالات کی تاریکی نے آنکھوں پر غفلت کے پردے ڈال دیے ہیں۔ ان کا اٹھنا محال ہے۔

اس شہر کی ناقدر شناسی ضرب المثل ہے۔ اس کی ایک مثال یہاں پر تحریر کی جاتی ہے۔ مرزا دبیر اور میر انیس ایسے شاعر اور مرثیہ خوان۔ اور لکھنؤ کے خاص شیعوں کا شہر۔ اور لکھنؤ کی تعزیہ داری مشہور آفاق مگر محرم میں یہ دونوں بزرگ ہمیشہ باہر جایا کیے کبھی لکھنؤ میں کسی کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ اُن کے مایحتاج کو مہیا کر دیتا کہ باہر جانے کی ضرورت نہ ہوتی۔

آتش فاقے کرتے کرتے مر گئے۔ ناسخ بھاگے بھاگے پھرے مگر پھر بھی وطن کی محبت میں فرماتے ہیں۔ لکھنؤ مجھ پر فدا اور میں فدائے لکھنؤ۔

یہ اُس زمانے کے تذکرے ہیں۔ جب یہاں افلاطون کے قدم نہ آئے تھے اور اب تو اونگھتے کو ٹھیلنے کا بہانہ۔ افلاس کا عذر عام ہے۔

مگر واضح رہے کہ افلاس کو ان خاندانوں سے کوئی تعلق نہیں جنھوں نے زمانۂ پر آشوب میں جسے عہدِ شاہی کہتے ہیں۔ مال مفت سے اپنے صندوقوں کو پُر کر لیا ہے۔ وہ یا ان کی اولاد چین کرتی ہے۔

یا وہ لوگ جن کے بزرگوں نے خزانہ عامرہ سرکارِ عالیہ میں رقم کثیر جمع کر کے کئی پشت تک اپنی اولاد کے ازدقہ کا بندوبست کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی کاہلی اور تن آسانی کا سبق پڑھا گئے ہیں۔ ایسے ہی خاندانوں میں ایک معزز خاندان کے نوعمر وارث کا یہ افسانہ تباہی ہے۔ اس کتاب سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ امراء جو تعلیم کو غیر ضروری اور تدِ فضول سمجھتے ہیں ان کی اولاد کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔ عموماً ہندوستان میں اور خصوصاً لکھنؤ میں یہ مرض پھیلا ہوا ہے کہ امراء تعلیم و تجربہ کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ حالاں کہ سب سے زیادہ ان کو اس کی ضرورت ہے۔ بالآخر ہم اس دیباچے کو اس دعا پر ختم کرتے ہیں کہ خدائے عالم و دانا ہمارے ملک کے امراء کو اعلیٰ درجے کی تعلیم کی ہدایت اور توفیق دے۔ اور ان کی اولاد کو کمینوں اور مفت خواروں کے دام سے بچائے۔

الداعی الخیر

مرزا رسوا

زوجۂ اولیٰ

ایک نامی عیاش کا قول ہے کہ عورتیں تین طرح کی ہوتی ہیں۔ اول حوریں دوسرے پریاں، تیسرے چڑیلیں۔

حوریں وہ جن کے باب میں کسی شاعر کا یہ شعر مشہور ہے۔

چیز قوتِ روح است و ہم بشرح حلال
سرود خانۂ ہمسایۂ حسن رہ گزرے

پریاں وہ جو تاروں کی چھاؤں میں آتی ہیں۔ اور تاروں کی چھاؤں میں رخصت ہو جاتی ہیں۔

چڑیلیں یعنی ماں باپ کی بیٹیاں جو سہرے جلوے سے بیاہ کے آتی ہیں۔ یہ وہ نیک بختیں ہیں جو زندگی بھر پیچھا نہیں چھوڑتیں اور مرنے کے بعد بھی چالیس دن لحد[1] پر بیٹھا کرتی ہیں۔

ایک ایرانی شاعر یادش بخیر فرماتے ہیں کہ جہاں عورت کے دو تین بچے ہوئے محرمات میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس کا ادب کرنا چاہیے۔ بیچارے حکیم صاحب قبلہ کی بیاہتا بی بی اس صف میں داخل تھیں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ جب سے حکیم صاحب نے عقدِ ثانی کیا تھا اپنے جیٹھڑوں سے بیزار رہتی تھیں ہر وقت منھ پھولا ہوا۔ ناک چڑھی ہوئی جو کام کرتی ہیں۔ جھٹک پٹک کے۔ چوڑیوں کی جھنکار بار بار سنائی دیتی تھی۔ بات بات پر آگ لگے۔ حضت بی بی کی جھاڑو پھرے۔ تل پھوٹے رو دینا۔ ہر وقت بڑبڑانا۔ غرض کہ ناک میں دم تھا۔

گلابی جاڑے کے دن تھے۔ خدا کے فضل سے لکھنؤ کی آب و ہوا اعتدال پر تھی۔ بڑے بڑے نامی گرامی حکیم ایسی فصل میں معطل رہتے ہیں (خدا کرے ہمیشہ معطل رہیں) حکیم صاحب کچھ ایسے نامور حکیموں میں بھی نہ تھے صرف محلے کے لوگ عندالضرورت یا بر سبیل احتیاط نسخہ لکھوا لیا کرتے تھے۔ حکیم صاحب کے پاس مرضا اس وجہ سے بھی کم آتے تھے کہ آپ نے چند روز سے میاں نبی بخش کے بھتیجے حسن علی کو درگاہ کے قریب عطاری کی دکان کروا دی تھی۔ ہر ایک مریض سے یہی فرمائش ہوتی تھی کہ وہیں نسخہ بندھوانا۔ ایک تو خود ہی بھاری داموں کا نسخہ لکھتے تھے اس پر میاں حسن علی پیسے کے دو پیسے لیتے تھے اس لیے کہ حکیم صاحب سے نصف کا معاملہ تھا اس کی کسر کیوں کر نکلتی۔ ایک اور سبب حکیم صاحب کی کساد بازاری کا یہ بھی تھا کہ اس محلے میں ایک برنچ اسپتال کھل گیا تھا۔ اس میں مفت دوا تقسیم ہوتی تھی۔ ان وجوہ سے حکیم صاحب بالکل بیکار رہتے حکیم صاحب کو

---

[1] لحد وہ مقام مراد ہے جہاں کوئی مرتا ہے جہاں نہلایا جاتا ہے جس جگہ پر چالیسویں تک چراغ جلایا جاتا ہے

اس کی چنداں پروا نہ تھی اس لیے کہ آپ نے اپنے محلے کے غریبوں کو روپیہ قرض دے دے کے اکثر مکان کفل کر لیے تھے۔ جو رفتہ رفتہ حکیم صاحب کے قبضے میں آگئے تھے۔ ساتھ آٹھ دوکانیں بازار میں بنوا دی تھیں۔ ان سب میں کرایہ دار رہتے غرض کہ معاش کی طرف سے اب بالکل اطمینان تھا۔ القصہ نو بجے حکیم صاحب گھر میں تشریف لے گئے۔

حکیم صاحب:۔ (بی بی سے) کہو صاحب کھانا تیار ہے۔

بی بی:۔ (غصے کی آواز سے) ابھی تو نہیں تیار ہے۔

حکیم صاحب:۔ دس بجا چاہتے ہیں۔ ابھی تک کھانا نہیں تیار ہوا۔

بی بی:۔ پھر نہیں تیار ہوا کیا کریں۔ جب سودا آئے گا جب ہی تو پکے گا۔ ابھی تو نبی بخش نے اروباں لا کے دی ہیں۔ گوشت نگوڑا گلا نہیں لکڑیاں گیلی سلگتی تھیں پھر کوئی چولھے میں اپنا سر لگا دے۔

حکیم صاحب:۔ میں نے چھ بجے سودے کے پیسے نبی بخش کو دیے تھے وہ اب اروباں لائے ہیں۔ راستہ میں کہیں بیٹھ کے حقہ پینے لگے ہوں گے۔

میاں نبی بخش بہت ہی باذاق آدمی تھے۔ جب حکیم صاحب گھر میں جاتے تھے وہ اندر کے دروازے کے پاس کان لگائے کھڑے رہتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ گھر میں جو باتیں ہوتی ہوں اسے سُنیں۔ وقتاً فوقتاً ہاں میں ہاں ملاتے رہیں شاید کوئی ایسی بات کان میں پڑ جائے جو مفید مطلب ہو۔ یا اگر حکیم صاحب یا ان کی بی بی کوئی امر آپ کی شان کے خلاف کوئی بات کہے تو فی الفور اس کی تردید کر دی جائے۔ چنانچہ اس موقع پر اروباں دیر میں لانے کا الزام لگایا گیا تھا اس کی تردید واجب ہو گئی تھی۔

نبی بخش:۔ بس شہر میں اونٹ بدنام ہے۔ ناؤ کس نے ڈبوئی خواجہ خضر نے۔ اکیلا آدمی اور دو دو جگہ کا سودا سلف۔

دو جگہ کا ذکر کرنا چنداں اس وقت ضروری نہ تھا۔ صرف حکیم صاحب کی

بیوی کو اشتعالِ طبع دینا منظور تھا۔

بی بی:۔ کیوں دو گھروں کا سودا سلف کیسا بیگم صاحب کے نوکر چاکر کیا ہو گئے۔

یہ ایک ایسی پتے کی بات تھی کہ حکیم صاحب بیچارے تو گویا جیتے جی زمین میں دفن ہو گئے۔

حکیم صاحب:۔ (برہم ہو کے) چلو تمھیں اس قصے سے کیا مطلب۔ تم اپنا کام کرو۔

بی بی:۔ لو ہمیں کچھ مطلب ہی نہیں

حکیم صاحب:۔ تم سے ہزار مرتبہ کہہ دیا کہ ان جھگڑوں سے تمھیں کیا۔ اب جو بات ہونا تھی وہ ہو گئی۔

بی بی:۔ خوب ہوا۔ خدا مبارک کرے ہے کوئی سو دو سو کا وثیقہ بیگم صاحب کا۔

حکیم صاحب:۔ نہ سہی وثیقہ۔ کوئی روپیہ کی لالچ سے میں نے نکاح کیا ہے۔

بی بی:۔ خدا جھوٹ کرے۔ اور کیوں نکاح کیا تھا۔ حسن دیکھ کے کیا ہو گا کم سن ہوں گی۔

اس موقع پر میاں نبی بخش نے وہ غضب کا ٹکڑا لگایا کہ بیوی کی باچھیں کھل گئیں اور حکیم صاحب بے چارے گل در گل ہو گئے۔

نبی بخش:۔ بیگم صاحب: میاں بیچارے پھنس گئے سن میں تو حکیم صاحب ہمارے ان کے آگے کے بچے معلوم ہوتے ہیں۔ صورت شکل بھی کچھ ایسی اچھی نہیں ہے۔

بیوی:۔ تو کیا تمھارے سامنے ہوتی ہیں۔

نبی بخش:۔ اب تو سامنے نہیں ہوتیں جب نواب علی بہادر کے پاس نوکر ہوئی ہیں ان دنوں میں کم سن تھیں میں بھی نواب صاحب کے مکان پر جایا کرتا تھا۔ وہیں میں نے انھیں دیکھا تھا۔ نواب کے ساتھ چنڈو کا بھی کچھ دنوں شوق کیا تھا۔

بیوی:۔ اور یہ کہو تو نوکر کاہے میں تھیں۔

نبی بخش:۔ اب یہ میں آپ سے کیا بتاؤں رئیس آدمی تھے ان کے دل بہلانے کو نوکر تھیں۔

بیوی:۔ تو یہ کہو تم بہت دنوں سے جانتے ہو۔

نبی بخش:۔ اے حضور میں تو ان کی سات پیڑھی سے واقف ہوں۔ ان کی ماں کیا تھیں خدا بچائے ایسی عورتوں سے۔ اور یہ خالہ صاحبہ جو اب ہیں ان کو آپ کیا کم سمجھتی ہیں۔ ایک ہی چھٹی ہیں۔

بیوی:۔ ان کی (یعنی حکیم صاحب کی) خلیا ساس کا حال مجھ سے پوچھو۔ نواب معزالدولہ کی سرکار میں ہمارے اباجان داروغہ تھے وہیں یہ نوکر ہوئی تھیں۔ وہاں نواب کی لڑکی کا کڑا اپرایا نکالی گئیں اب تو سنا ہے بڑی پاک صاف بنی ہیں۔

حکیم صاحب:۔ وہ نہ ہوں گی۔ بیچاری زیارت کر آئی ہیں۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھتی ہیں۔ وہ کوئی اور ہوں گی۔

بیوی:۔ میں سچ کہتی ہوں۔ آپ کی خلیا ساس نے کڑا چرایا تھا۔ نواب نے مشکیں باندھ دی تھیں وہ تو کہو ہمارے اباجان نے بچالیا۔

حکیم صاحب:۔ جی ہاں آپ کے اباجان ایسے ہی تھے۔

بیوی:۔ ہمارے اباجان کو تو خدا نے وہ لیاقت دی تھی کہ جدھر سے نکل جاتے تھے لوگ ان کو جھک جھک کر سلام کرتے تھے۔

حکیم صاحب:۔ کیوں نہیں۔ نواب کے ہاں کبوتر بازوں میں نوکر تھے۔ اب تم نے داروغہ صاحب کر دیا۔

بیوی:۔ خیر شاہین داماد نے کبوتر باز تو بنا دیا۔

حکیم صاحب:۔ سارا زمانہ جانتا ہے۔

بیوی:۔ سارا زمانہ جانتا ہے۔ روّنوں میں نوکر تھے۔ پھر آپ نے کیوں جھک مارا۔

حکیم صاحب:۔ ہم نے کیوں جھک مارا۔

بیوی:۔ اچھا جس نے تمھاری شادی کی اس نے جھک مارا۔

حکیم صاحب:۔ ماموں نے پھنسا دیا۔ ہمارے ابا جان تو رانڈی بھی نہ تھے۔

بیوی:۔ چلو اب تو ذات دنتی لائے ہو۔ ماں باپ کی بیٹی۔ دان دہیز والی۔ جائداد، نوٹ، تنخواہ، وثیقہ خاک۔

حکیم صاحب نہایت جز بز تھے۔ کوئی بات بن نہ پڑتی تھی۔ بیوی کی گرفتیں اس قدر معقول تھیں کہ سوائے بغلیں جھانکنے کے اور کچھ بن نہ پڑتا تھا۔

حکیم صاحب:۔ چلو تمھارے طعنے دینے کو تو ہو گیا۔

بیوی:۔ کیوں کیا اب اس سے بھی گئے۔

حکیم صاحب:۔ اچھا کھانا جلدی تیار کرو۔

بیوی:۔ (باورچی خانے سے اُٹھ کے تخت پر آ بیٹھیں) ہم سے کھانا وانا نہیں پکتا۔ کیا کوئی ماما اصیل مقرر کیا ہے۔ مامائیں نوکر رکھو یا اس مال زادی خانگی سے پکواؤ۔ جس کو بیوی بنا کے بٹھایا ہے۔

حکیم صاحب:۔ یہ تمھیں ہو کیا گیا ہے؟ میں کہتا ہوں کچھ سڑن تو نہیں ہوئی ہو۔ خواہ مخواہ لڑتی ہو۔

بیوی:۔ ہم کیوں سڑن ہونے لگے سڑی تم، سڑی تمھاری بیگم صاحب بیگم صاحب بنی ہے موئی خانگی۔ وہیں جانے کی دیر ہوتی ہے اس لیے کھانے کی جلدی ہو رہی ہے۔

حکیم صاحب آدمی مصلحت اندیش تھے دیکھا کہ بیوی بگڑ گئی ہیں۔ اب اگر زیادہ بحث بڑھی تو کھانا وانا نصیب نہ ہوگا۔ بہ آشتی و نرمی چاہا کہ بات ٹل جائے۔

حکیم صاحب:۔ مجھے کچہری جانا ہے۔ جج صاحب دس بجے آجاتے ہیں۔ اگر پیشی پر حاضر نہ ہوں گا۔ مقدمہ خارج ہو جائے گا۔ تمھیں لڑائی سوجھی ہے۔ پھر لڑ لینا۔ اب اس وقت معاف کرو۔

بیوی نے دیکھا کہ میاں دب گئے۔ اور شیر ہو گئیں۔ سچ مچ دل میں ٹھان

لیا کہ آج کھانا دانا نہ پکاؤ۔ دیکھیں تو میاں کس حد تک دب سکتے ہیں۔

بیوی: ۔ کچہری جانا ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ چاہتی بیگم کے پاس جانا ہے۔

حکیم صاحب کو واقعی کچہری جانا تھا۔ بوجوہ چند در چند چاہتی بیگم سے حکیم صاحب کو نفرت ہو گئی تھی۔ بلکہ چاہتے تھے کسی طرح گلو خلاصی کریں۔ مگر یہ ممکن نہ تھا اس لیے کہ چاہتی بیگم صاحب کب پیچھا چھوڑتی تھیں حکیم صاحب تھے بڑے سیانے۔ مگر اس معاملے میں ایسا دھوکہ کھایا کہ جعل سازی کا فلسفہ جس قدر یاد تھا سب بھول گئے تھے۔ اس لیے کہ پچاس روپیہ پاندان کا لکھ چکے تھے۔ وہ بذریعہ عدالت وصول ہو سکتا تھا۔ روٹی کپڑے کی فوج داری سے ڈگری ہو سکتی تھی۔ مہر کی نالش دیوانی میں دائر ہو سکتی تھی۔ غرض کہ کلثوم بیگم چٹھی نویس نے بلکہ درحقیقت مرشد اور خلیفہ نے اپنی طرح مشکیں کس لی تھیں۔ چٹھی نویس کو بھی حکیم صاحب کا چنداں اشتیاق نہ تھا۔ صرف فریب دہی کی راہ سے شادی ہوئی تھی۔ امامن مہری اور میاں امجد نے اپنا اپنا اجورہ پہلے ہی وصول کر لیا تھا اگرچہ حکیم صاحب بیچارے کے ساتھ پورا جعل کیا گیا مگر کوئی موقع گرفت کا نہ تھا۔ اقرار نامہ اس پیچ سے لکھوایا گیا تھا کہ اس سے کسی قسم کا جرم کسی متوسط یا صاحب معاملہ پر عائد ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ کلثوم بیگم کے ساتھ عقد ہوا تھا کلثوم چٹھی نویس کا نام تھا چھوٹے نواب کی ماں کا نام کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ کیوں کہ وہ خود اور ان کے بزرگ مرشد آباد کے رہنے والے تھے۔ واقعی وہ صاحب جائداد تھیں کئی لاکھ کے نوٹ تھے اس کا سود مرشد آباد سے آیا کرتا تھا لکھنؤ کے وثیقہ آفس سے اس کو کوئی تعلق نہ تھا۔ ان کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ ان کے نام سے کیا جعل بندیاں پھیلائی گئی ہیں۔

عقد ہونے کے دس ہی پانچ برس کے بعد یہ جعل سازی کھل گئی مگر حکیم صاحب کر ہی کیا سکتے تھے۔ اب یہیں پر ہم ایک راز کھولے دیتے ہیں۔

وہ مکان جو حکیم صاحب کے نام رہن ہوا تھا اس کا رہن نامہ بھی جعلی تھا۔ بات یہ تھی کہ ایک عورت کو ڈولی میں بٹھا کے رجسٹری آفس لے گئے اُس کے نام

سے مکان کی رجسٹری اور سر خط ہو گیا۔ اصل مالک کو اطلاع بھی نہ تھی۔ صرف کرائے کا مکان لے لیا گیا تھا۔ حکیم صاحب اس مقدمے کو فوج داری میں چلا سکتے تھے مگر اس سے ہونا ہی کیا تھا۔ اگر جعل کا ثبوت کامل پہنچتا تو میاں امجد برس دو برس کے لیے قید ہو جاتے۔ یہ ایسے لوگوں میں تھے جو جیل خانہ کو سسرال کہا کرتے ہیں۔ دو مرتبہ اس سے پہلے قید ہو چکے تھے۔ حکیم صاحب سمجھے کہ امجد کے قید کرنے سے نفع کیا ہو گا۔ صرف حسرت انتقام ایسی چیز نہیں جس کے پورے ہونے سے بندۂ زر کی تشفی ہو سکتی ہو۔

اس وقت حکیم صاحب کا معدہ غذا سے بالکل خالی تھا۔ کچہری جانے کی دیر ہو رہی تھی۔ بیوی مچلی ہوئی بیٹھی تھیں۔

بیوی:۔ اگر میں آج سے کھانا پکاؤں تو میری موئی جیتی پر طلاق ہے۔ میرے جینے پر طلاق ہے۔

آج بیوی نے برے وقت غمزہ کیا۔ ایک وجہ اس کی اور بھی تھی۔ وہ یہ کہ بیوی کے میکے میں ایک لڑکے کی دودھ بڑھائی ہوئی تھی۔ وہاں سے ہلجا کا حصہ آیا تھا۔ اس میں پوریاں اور تھوڑا سا قیمہ گوشت پانچ گلگلے تھوڑا سا رحم تھا وہ یہ سات بجے سے کھا کے بیٹھ رہی تھیں۔ گلگلے بچوں کو کھلا دیے تھے۔ غرض کہ حکیم صاحب کے لیے بالکل صفائی تھی۔

حکیم صاحب:۔ تو کھانا پھر تم آج سے نہ پکانا

بیوی:۔ ہم تو قسم کھا چکے۔ کبھی نہ پکائیں گے۔

حکیم صاحب نے دیکھا کہ اب جلال شوہری کے دکھانے کا موقع ہے۔ بے اس کے بات ہی نہ بنے گی غصہ میں بھرے ہوئے اُٹھے اور گوشت کی پتیلی جو چولھے پر چڑھی ہوئی تھی۔ اسے اٹھا کے انگنائی میں اچھال دیا اتفاق ناگہانی کہیں ایک بوٹی اچھل کے بیوی کے پاؤں پر پڑ گئی۔ اب کیا تھا گویا بم کا گولا ٹوٹا بیوی نے چیخ چیخ کے رونا شروع کیا۔ تخت پر دھڑا دھڑ دو ہتھڑ پڑ رہے ہیں۔ ہائے مار ڈالا ہائے جلا دیا ہے ہے مجھے بے وارثا سمجھا ہے۔ ہے ہے ابا جان۔ ہے ہے اماں جان۔ اب اس

طرح سے رونا شروع کیا۔ جیسے اسی وقت اباجان نے انتقال کیا ہے۔ اس کے بعد شادی کرنے والے (یعنی حکیم صاحب کے والدین) الٰہی شادی کرنے والوں کی گور میں کیڑے پڑیں۔ ہائے مجھے کس آفت میں پھنسایا۔

حکیم صاحب:۔ (بزرگوں کی اہانت پر غصہ ہی آگیا) کس نے شادی کی تمہارے باپ نے شادی کی۔

بیوی:۔ (روتی جاتی ہیں۔ اور جواب دیتی جاتی ہیں) ہمارے اباگئو آدمی تھے ان کو موئے جعلیوں نے فریب دیا۔ ہائے ہمارے اباجان کیا جانتے تھے۔ اس موئے جعلیے سے پالا پڑے گا۔ ہائے موئے جعلیے خدا کی مار موؤں کو ہیضہ کھائے۔

حکیم صاحب:۔ بس اب چپ رہو۔ بہت ہو چکی۔

بیوی:۔ (اور چیخ کے) چپ رہوں۔ کوس کوس کے کھا جاؤں گی۔ جیسے مردے لوئے میرا پیر جلایا ہے

حکیم صاحب:۔ تو کیا میں نے جان کے پاؤں جلا دیا

بیوی:۔ میں قسم کھاتی ہوں جان بوجھ کے پتیلی میرے سر پر کھینچ ماری۔ وہ تو میں ہٹ نہ جاتی تو مغز پھٹ گیا ہوتا۔ تو تو میرے لہو کا پیاسا ہے۔

حکیم صاحب:۔ (اب دیکھا کہ کسی طرح چرخہ رکتا ہی نہیں پھر ذرا نرم ہو گئے) نیک بخت چپ رہ۔

بیوی:۔ نیک بخت۔ نیک بخت تیری چاہیتی۔ نیک بخت تیری اماں۔ نیک بخت تیری بھینا۔ لو اب ہم نیک بخت ہو گئے۔

حکیم صاحب:۔ اچھا پھر کیا کہوں۔ نیک بخت کوئی بری بات کہی۔

نبی بخش:۔ (ڈیوڑھی میں کھڑے خیگ روم و روس کے مزے لے رہے ہیں) خانم صاحب یہ تو کوئی بری بات نہیں کہی۔

بیوی:۔ آج تک نیک بخت نہ کہا۔ بری بات ہم نہیں بنتے نیک بخت جو

نیک بخت ہو اُن ہی مبارک رہے ہم تو بد ہیں۔

حکیم صاحب:۔ تم اپنی زبان سے بدبختی ہو میں تو نہیں کہتا۔

بیوی:۔ ہاں۔ ہاں۔ ہم تو بد ہیں۔

اب حکیم صاحب بہت ہی عاجز ہوئے۔ ادھر اس جھگڑے میں دس بج گئے حکیم صاحب بیچارے چپکے اٹھے باہر چلے گئے۔

نبی بخش:۔ حضور نہاری روٹی لا دوں۔ کھا لیجیے بلا سے کچہری تو چلے جائیے۔

حکیم صاحب:۔ (سمجھے کہ اس وقت یہی قرین مصلحت ہے) اچھا لا دو۔

نبی بخش:۔ پیسے دیجیے۔

حکیم صاحب نے پانچ پیسے نکال کے دیے۔ دو پیسے کی نہاری۔ تین پیسے کی روٹیاں۔

نبی بخش:۔ اچھا تو لاؤں کاہے میں۔ اندر سے دسترخوان اور پیالہ لا دیجیے۔

حکیم صاحب اندر گئے باورچی خانہ سے دسترخوان اٹھایا۔ الماری پر سے چینی کا پیالہ اٹھایا۔ بیوی آنسو وانسو پوچھ کے بیٹھی ہیں کن آنکھوں سے دیکھ رہی ہیں۔ کہ یہ کرتے کیا ہیں۔ جوں ہی حکیم صاحب پیالہ اور دسترخوان باہر لے کے چلے بیوی نے پیالہ ہاتھ سے چھین لیا۔

بیوی:۔ ہاں ہم بھوکے بیٹھے رہیں۔ تم باہر نہاری روٹی منگا کے نگلو ہم تو پیالہ نہ دیں گے۔

حکیم صاحب نے چاہا ہاتھ سے پیالہ چھڑا کے باہر لے جائیں۔ اس چھینا جھپٹی میں ہاتھ سے پیالہ گر پڑا چھن سے ٹوٹ گیا۔

ایک تو گوشت کی پتیلی اچھال گئی وہ نقصان ہوا۔ دوسرے چینی کا پیالہ بزرگوں کے وقت کا ٹوٹا تیسرے بھوک کی جھانجھ بیوی کی کج بحثیوں کا غصہ۔ نبی بخش کے ٹکڑوں کا کھسیانا پن۔ مقدمہ کے خارج ہو جانے کا اندیشہ اس مواد نے جمع ہو کر حکیم صاحب کی قوت غضبی کو ہیجان میں ڈال دیا۔ ڈھیلے ہاتھ

سے ایک طمانچہ انھوں نے بیوی کے جھریاں پڑے ہوئے گالوں پر جما دیا۔

چلیے اب کیا تھا گویا بیلی گارد کی سرنگ میں آگ بتا دی گئی۔ بیوی وہیں پاؤں پھیلا کے زمین پر بیٹھ گئیں دو ہتھڑ چلنے لگے۔ ایک چیخ زمین۔ اور ایک آسمان

بیوی:۔ الٰہی ہاتھ ٹوٹیں۔ الٰہی ہاتھ سڑیں۔ الٰہی ہاتھوں میں کیڑے پڑیں۔ طمانچہ مارنے والا مرے۔ طمانچہ مارنے والا غارت ہو۔ اے مولا تیری لاٹھی میں آواز نہیں۔ اٹھوارہ کٹے۔

حکیم صاحب:۔ اب سزا کو پہنچیں۔ اور لو۔ یہ کہہ کے حکیم صاحب بڑھے ایک طمانچہ اور مارا۔ بیوی نے دھڑ سے سر زمین پر دے مارا۔

بیوی:۔ لے موئے میں خود سر پھوڑے لیتی ہوں۔

واقعی بیوی کا سر پھٹ گیا۔ دھل دھل خون بہنے لگا۔ اس کے بعد بیوی نے چلانا شروع کیا۔

بیوی:۔ (بین کرنے کے لہجے میں) ہائے اب تو میرا سر پھوٹا۔ خون بہہ رہا ہے۔ ہائے بے وارثا سمجھ کے مجھے مار ڈالا۔ ہائے سر پھوٹا۔ ہائے مغز پھٹ گیا۔

شور و غل کی آواز سن کے محلے کے لوگ دروازے پر جمع ہو گئے۔ اسی اثنا میں خدا جانے کس نے حکیم صاحب کے سالے کو خبر کر دی۔ یہ ایک گرگہ بے تکان لکھنؤ کے کڑک بانکوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ بہن کے پٹنے کی خبر سن کے لٹھ ہاتھ میں اٹھایا اور اپنے ساتھ دس بارہ گرگوں کو جمع کر کے فوراً موقع واردات پر پہنچ گئے۔ ساتھ والوں کو ڈیوڑھی میں کھڑا کیا۔ خود گھر میں گھس آئے۔

اب تو حکیم صاحب گھبرائے

مظہر:۔ (حکیم صاحب کے برادر نسبتی کا نام تھا) حکیم صاحب کی طرف برے تیوروں سے گھور کے یہ کیا حرکت تھی۔

حکیم صاحب:۔ حرکت کیا تھی۔ اپنا سر پھوڑ لیا۔

منظر:۔ درست لگے مجھ سے جعلیہ پن کرنے یہ نہیں کہتے کہ عورت کا سر پھاڑ ڈالا۔

حکیم صاحب:۔ نہیں خود سر پھوڑ لیا۔

منظر:۔ یہ عدالت میں بیان کیجیے گا۔ عورت ذات کی اتنی جرأت ہی نہیں ہو سکتی کہ اپنا سر آپ ہی پھوڑے کیوں بھائی چھٹن (منظر کے پیر بھائی اور کچھ دور کا رشتہ بھی تھا) ڈیوڑھی میں لٹھ باندھے کھڑے تھے دروازے کے پاس پہنچ گئے۔ اندر دھنستے آتے ہیں۔

چھٹن:۔ (دروازے کے اندر منھ ڈال کے) کیا سچ مچ سر پھوٹ گیا۔

منظر:۔ جی ہاں سر کھل گیا۔ خون کا دریا بھرا ہوا ہے۔ اور جناب حکیم صاحب فرماتے ہیں کہ آپ ہی سر پھوڑ لیا۔

چھٹن:۔ (ہنس کے) اچھا تو پولیس کو خبر کر دوں۔

منظر:۔ (پولیس کو ایک گالی دے کے) کوئی ہم دبیل ہیں۔ ابھی یہیں ان کی مرمت کیے دیتے ہیں۔ یہ کہہ کے حکیم صاحب کا ہاتھ پکڑ کے ایک دو ڈگ رسید کیے۔ حکیم صاحب بھی لپٹ پڑے۔ میاں منظر نے انٹی دے کے ان کو زمین پر دے مارا اور ایک دو تین گھسے بتا دیے کس کے۔ حکیم صاحب بیچارے مچھلی کی طرح پھڑکنے لگے۔ بیوی دوڑ کے کوٹھری میں جا چھپیں۔ چھٹن اور ان کے ساتھ کے پانچ چار آدمی اندر گھس آئے۔ حکیم صاحب کی اچھی مرمت کی۔ میاں نبی بخش بیچارے منمنا سے آدمی کر ہی کیا سکتے تھے مارے خیر خواہی کے دوڑ کے چوکی پر خبر کر دی۔ وہاں سے ایک حولدار اور دو برقنداز چلے آئے۔ اظہارات ہونے لگے۔

حولدار:۔ یہ کیا واردات ہوئی۔

منظر:۔ (حکیم صاحب کی طرف اشارہ کر کے) انھوں نے ہماری بہن کا سر پھوڑ ڈالا۔

حولدار :۔ کہاں ہے تمھاری بہن۔

منظہر :۔ یہیں ہے اور کہاں ہے ؟

حولدار :۔ بلاؤ۔

منظہر :۔ بلائیں کیوں کر۔ پردہ نشین عورت ہے۔

حولدار :۔ تو پھر ہم اظہار کیا لکھیں۔

منظہر :۔ اظہار لکھوا دیں گی۔

حولدار :۔ (حکیم صاحب کی طرف اشارہ کرکے) یہ تمھارے کون ہیں۔

منظہر :۔ بہنوئی

حولدار :۔ (حکیم صاحب کی طرف مخاطب ہوکے) آپ فرمائیے کیا معاملہ ہے

حکیم صاحب :۔ یہ تو جیسے آدمی ہیں ان کی وضع سے ظاہر ہے۔ بات یہ ہے کہ میں نے دوسرا عقد کیا ہے اس وجہ سے ان کی بہن مجھ سے خواہ مخواہ لڑا کرتی ہیں۔ آج بھی اسی طرح لڑائی ہوئی۔ انھوں نے ایک ٹکر زمین پر ماری۔ سر میں چوٹ ضرور آئی۔ اتنے میں کسی نے ان کو خبر کر دی۔ یہ وہاں سے دس بارہ لنگاروں کو لیے ہوئے میرے مکان میں گھس آئے۔ کئی آدمیوں نے مل کے مجھے مارا۔

منظہر :۔ یہ جھوٹ کہتے ہیں۔ جس وقت میں آیا ہوں یہ اپنی بیوی کو مار رہے تھے میں نے آکے چھڑا دیا۔

حکیم صاحب :۔ خدا سے ڈرو۔ کون مار رہا تھا۔

منظہر :۔ تم خدا سے ڈرتے ہو۔ خود عورت کا سر پھوڑا اور ہم سے کہتے ہو خدا سے ڈرو۔

حولدار :۔ حکیم صاحب بے شک غصہ بری چیز ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے کوئی جرم نہیں کیا۔ مگر مقدمہ سنگین ہے تھانے پر ضرور چلنا پڑے گا اور مسماۃ کو بھی ڈولی پر سوار ہوکے جانا پڑے گا۔

حکیم صاحب:۔ مگر آپ سمجھے کہ اس میں ایک ذرا ہماری توہین ہے۔
یہ کہہ کے حولدار کی طرف ان نگاہوں سے دیکھا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ دس بارہ روپیہ لے لیجیے اور مقدمے کو یہیں رفع دفع کر دیجیے میاں مظہر بھی پولیس کی مداخلت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ منہ پھیر کے علیحدہ کھڑے ہو گئے۔ کیوں کہ یہ بھی شریف کہلاتے تھے۔ باوجود اس قدر لنگارے پن کے کسی قدر بوئے شرافت باقی تھی۔ ہمشیرہ کا انتقام حسب مرضی لے چکے تھے۔ اور ان کو اپنے زورِ بازو پر اتنا غرہ تھا کہ جب چاہیں گے حکیم صاحب کو دھنسا لیں گے دوسرے یہ بھی ان کو اچھی طرح معلوم تھا کہ حکیم صاحب نے سر نہیں پھوڑا۔ یہ ہمشیرہ صاحبہ کے فعل ہیں۔

حولدار:۔ (حکیم صاحب کے اشارہ کو سمجھے اور چشم و ابرو سے جواب بھی دے دیا کہ اتنے پر معاملہ نہ ہوگا) نہیں تو حکیم صاحب اس میں میرا کچھ اختیار نہیں ہے۔ تھانے دار صاحب کے پاس چلے چلیے جیسا وہ کہیں ویسا کیا جائے گا حکیم صاحب خوب جانتے تھے کہ اگر خدانخواستہ تھانے دار صاحب تک جانے کی نوبت آئی تو بغیر ایک پچاسا دیے ہوئے چھٹکارا نہ ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ یہیں کچھ اور بڑھا دو۔ یہ اس فکر میں تھے کہ ایک برقنداز کرم خاں نامی آگے بڑھا اور حولدار کا ہاتھ پکڑ کے علیحدہ لے گیا۔ دو باتیں چپکے چپکے کیں۔ اور چلا کے حولدار صاحب جانے دو۔ بیوی میاں کا معاملہ ہے۔ حکیم صاحب شریف آدمی ہیں۔ اِدھر مستغیث کی طرف سے بھی بظاہر رضامندی کا اظہار ہے جانے دو۔

حولدار:۔ (ہنس کے) مگر ایسا نہ ہو۔ تھانے دار صاحب کو خبر ہو۔

کرم خاں:۔ نہیں کون خبر کرے گا۔

چیت سنگھ:۔ (دوسرا برقنداز) جانے دو سسر کون بڑا معاملہ ہے۔ بی بی میاں میں لڑائی ہوئی۔ لکھنؤ کی عورتیں تم جانتے ہو ٹکر و کر مار لہن ہوئیں۔

مظہر:۔ نہیں تو پولیس کی دست اندازی اس معاملہ میں ہم بھی نہیں پسند کرتے۔

حولدار:۔ تم کیوں پولیس کی دست اندازی پسند کرو گے۔ تھانے دار صاحب کے سامنے جاتے ہوئے تو تمھاری نانی مرتی ہے۔

مظہر بڑے بانکے ترچھے تھے۔ مگر حولدار کے سامنے منھ سے بات نہ نکلی۔ اس لیے کہ آپ کی وضع ظاہری اس قسم کی تھی کہ پولیس جب چاہے بدمعاشی میں چالان کر دے اور آپ سال دو سال کے لیے عالم باغ کی سیر کر آئیں۔ خلاصہ یہ کہ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔

اس مقدمہ کے طے ہونے کے بعد حکیم صاحب نے پھر کچہری جانے کا قصد کیا مگر ایک رفیق نے آکے خبر دی کہ مقدمہ عدم پیروی میں خارج ہو گیا۔ چلیے کچہری جانے کی تکلیف بچ گئی۔

زوجہ ثانیہ

یہاں تو حکیم صاحب پر واردات گزری۔ وہاں سنیے کہ نہیں معلوم کس نے (کس نے کہا میاں نبی بخش نے) تمام واقعات من وعن بیان کر دیے۔ سر شام حکیم صاحب جو گئے تو بیگم صاحب نے اس طرح مزاج پرسی کی۔

کلثوم بیگم:۔ سنتی ہوں آج تو آپ کے مکان پر بڑا معرکہ ہوا۔

حکیم صاحب:۔ (جھینپ کے) جی ہاں۔ گھر میں لڑائی ہوئی انھوں نے غصہ میں اپنا سر پھوڑ لیا سالے صاحب دوڑے آئے مجھ سے ہشت مشت ہوئی۔

کلثوم بیگم:۔ وہ تو موا ایک ہی گرگا ہے میں نے سنا ہے اس نے تمھیں اٹھا کے پٹخ دیا۔ اور خوب مارا۔

حکیم صاحب:۔ میں نے بھی مارا۔

نبی بخش یہاں بھی ساتھ تھے ممکن کیا تھا کہ حکیم صاحب کوئی امر خلاف واقع بیان کر سکتے۔ کیوں کہ میاں نبی بخش کی للو کسی جگہ رکتی ہی نہ تھی۔ وہاں تو ڈیوڑھی میں سے کھڑے ٹکرے لگا رہے تھے یہاں بالمواجہ گفتگو ہو رہی تھی۔ اس لیے کہ کلثوم بیگم ایسے لوگوں (مثلاً میاں نبی بخش) سے پردہ کرنا خلافِ شان سمجھتی تھیں۔

نبی بخش:۔ ایک گھونسہ میاں نے بھی کرارا مارا تھا۔ وہ تو اس نے دونوں ہاتھ ایسے گانٹھ لیے کہ میاں ہمارے پھڑ پھڑانے لگے

حکیم صاحب:۔ ایک گھونسہ؟ تین گھونسے میرے ایسے پڑے ہیں کہ میاں مظہر یاد کرتے ہوں گے۔

نبی بخش:۔ نہیں حضور میں تو کھڑا دیکھ رہا تھا جب اس نے دونوں ہاتھ آپ کے جانگھ کے نیچے دبائے ہیں اس وقت میرے جی میں آیا کہ اندر گھس آؤں۔ مگر چھٹن نے ہاتھ پکڑ کے مجھے دروازے سے باہر کر دیا اس وقت مجھے کچھ نہ بن پڑی۔ چوکی پر دوڑا گیا۔

حکیم صاحب:۔ یہ تم نے عین حماقت کی۔ بھلا تھانے پر جانا کیا ضرور تھا۔ سارے محلے میں ذلت ہوئی اور پندرہ روپیہ مفت دینا پڑے۔

نبی بخش:۔ جی ہاں۔ اب تو کہیے ہی گا۔ حماقت کی! جب حولدار آئے ہیں جب ہی تو مظہر نے آپ کو چھوڑا ہے نہیں تو دبائے ہوئے بیٹھا تھا اور اوپر سے گھونسے مار رہا تھا۔

کلثوم بیگم:۔ اور بیوی صاحب کہاں تھیں۔

نبی بخش:۔ وہیں تھیں اور کہاں تھیں۔ جب چوکی پر سے آدمی آئے ہیں اس وقت کوٹھری میں جا چھپیں

کلثوم بیگم:۔ یہ سامنے بیٹھی دیکھا کیں اور میاں پٹا کیے۔ خدا ہی ایسی عورتوں سے بچائے نام تو بیاہتا کا ہے۔ ایسوں ہی سے مردوے راضی بنتے ہیں۔

نبی بخش:۔ (حقہ کا ایک کش لے کے) واللہ حق ہے۔

کلثوم بیگم :۔ میں تو ایسے بھائی کو خاک میں ملا دیتی جو میاں کو مارے۔ اُڑ جائے وہ بھائی زمین کا پیوند ہو ایسا بھائی۔ دیکھو تو ادھر کا سارا کلہ سوجا ہوا ہے۔

نبی بخش :۔ کلہ سوجا ہوا ہے۔ میں کہتا ہوں سارا بدن چور چور ہے۔ میں نے تو اسی وقت کہا تھا دودھ میں پھٹکری ڈال کے پی لیجیے۔

کلثوم بیگم :۔ تو کیا نہیں پیا؟

نبی بخش :۔ کہاں پیا۔

حکیم صاحب :۔ نہیں کچھ ایسی چوٹ نہیں آئی تھی۔

نبی بخش :۔ یہ تو میاں کے کہنے کی بات ہے چوٹ کیوں نہیں آئی۔ پروائی ہوا چلے گی تو معلوم ہوگا۔

یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں خلیا ساس (یعنی کہ بی مغلانی) تسبیح پڑھتی ہوئی چلی آئیں حکیم صاحب نے جھک کے بندگی کی۔

خلیا ساس :۔ جیتے رہو۔ سلامت رہو۔ ہاں میں نے سنا ہے بڑی لڑائی ہوئی۔

اب سارا قصہ ان کے آگے دوہرایا گیا۔ اس طرح کہ کلثوم بیگم اپنی شستہ و رفتہ تقریر سے ہر واقعے کو بیان کر رہی تھیں اور میاں نبی بخش نمک مرچیں لگاتے جاتے تھے۔ اور خلیا ساس حسب موقع اوہی معاذ اللہ ہے ہے کہتی جاتی تھیں۔ آخر میں انھوں نے یہ نتیجہ نکالا۔

خلیا ساس :۔ میں کنیزو (حکیم صاحب کی بی بی کے چھٹپنے کا نام تھا۔ اور جو بزرگ پیار سے اور غیر عورتیں تحقیر سے لیتی ہیں) کو بچپنے سے جانتی ہوں۔ بڑی فیلیا ہی ہے۔

نبی بخش :۔ آپ سچ کہتی ہیں۔ واللہ میں تو خدا لگتی کہوں گا آج میاں کا کچھ بھی قصور نہ تھا صرف کھانے کے لیے کہا تھا۔ اس پر انھوں نے یہ مانا مت ڈالی۔ اچھا وہ تو جو کچھ ہوا۔ وہ ہوا آپ دودھ پھٹکری منگاتی تھیں لائیے لا دوں۔ ادھر سے تمباکو بھی اپنے لیے لیتا آؤں گا۔

کلثوم بیگم نے زینت (کلثوم بیگم کی ماما کا نام تھا) آواز دے کے صندوقچہ منگایا۔

حکیم صاحب :۔ نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے۔

کلثوم بیگم :۔ تم بکا کرو۔ میں ضرور پلاؤں گی۔ دیکھتی ہو۔ خالہ جان کہیں روبڑی میں رہ جائے گا تو قیامت ہو جائے گی۔

خلیا ساس :۔ نہیں میں کربلا سے موم بائی لائی تھی۔ وہ کہیں رکھی ہوئی ہے۔ دیکھوں صندوقچے میں یقین ہے پڑی ہو۔

نبی بخش :۔ بس تو فقط دودھ بازار سے منگوا لیجیے موم بائی کی کیا بات ہے۔ سنا ہے ساری چوٹ اندر سے کھینچ لیتی ہے۔

اتنے میں زینت صندوقچہ لے ہی آئی۔ کلثوم بیگم نے چار پیسے نکال کے نبی بخش کو دیے۔ دودھ لینے کو بازار گئے۔ خلیا ساس موم بائی ڈھونڈھنے کے لیے اندر کے دالان میں گئیں۔ کلثوم بیگم اور حکیم صاحب میں پھر اسی معاملے پر از سرِ نو بحث چھڑ گئی۔ اب اس بحث کا یہ رخ بدلا کہ اس لڑائی کو زوجہ ثانیہ کی ذات سے کس قدر تعلق ہے۔

کلثوم بیگم :۔ اچھا یہ تو سب کچھ ہوا۔ اب یہ بتاؤ کہ اس لڑائی کی اصل بنا کیا ہے۔

حکیم صاحب :۔ یہ تم آپ ہی سمجھ سکتی ہو۔

کلثوم بیگم :۔ یہ تو میں پہلے ہی سمجھے ہوئے تھی کہ میرے بارے میں لڑائی ہوئی۔ پھر میں اب نہیں چھوٹ سکتی۔ تو یہ لڑائیاں روز یوں ہی رہیں۔

حکیم صاحب :۔ جی ہاں سب اچھے رہے میری جان غضب میں پڑ گئی۔

کلثوم بیگم :۔ سب میں تو میں بھی آ گئی۔ میرے سبب سے کیوں تمھاری جان غضب میں پڑی۔ اور اگر یہ سچ ہے تو پھر تم نے کیوں ایسا کام کیا۔

حکیم صاحب :۔ (ایک آہ سرد بھر کے) ہاں اب تو حماقت ہو گئی۔ پھر اس کا علاج

کلثوم بیگم :۔ تم حکیم ہو۔ علاج تم ہی بتاؤ۔ اچھا مجھے چھوڑ دو تمھاری جان آفت سے چھوٹ جائے۔

حکیم صاحب :۔ (ایک ذرا تامل کے بعد) چھوڑ دینے کا تو میں نے نام نہیں لیا۔ تم خود آج سمیت پانچ چھ مرتبہ کہہ چکی ہو۔ آخر تمھارا کیا منشا ہے۔

کلثوم بیگم :۔ دیکھو حکیم صاحب تمھاری بیوی ہیں جاہل۔ اور میں خدا کے فضل سے ناخواندی نہیں ہوں۔ یہ موئی امامن نے مجھے تمھیں دونوں کو پھنسایا۔ موئی نے مجھ سے تو یہ بیان کیا کہ نہنگ ہیں۔ اور تم کو یہ فریب دیا کہ چھوٹے نواب کی ماں کے ساتھ نکاح کروائے دیتی ہوں۔ میں بھی دھوکے میں آگئی۔ اور تم بھی۔ میں اگر جانتی تم چپونٹیوں بھرے کواب (کباب) ہو تو کاہے کو یہ امر ہوتا۔

حکیم صاحب :۔ ہاں میں سمجھتا ہوں کہ تم اس واقعے میں بے قصور ہو۔ تمھیں بھی دھوکہ دیا گیا۔

کلثوم بیگم :۔ اچھا تو اب بھی کچھ نہیں گیا ہے۔ تم مجھے چھوڑ دو۔ خالہ کربلا جانے کو کہہ رہی ہیں اُن ہی کے ساتھ میں بھی چلی جاؤں گی۔ تین حصہ مہر میں تمھیں معاف کر دوں گی۔ ایک حصہ دے دو۔

حکیم صاحب :۔ اگر میں اپنی تمام جائداد بیچ ڈالوں۔ بلکہ میں بھی بک جاؤں تو بھی مجھ سے ایک چہارم حصہ مہر نہ ادا ہو سکے گا۔ اور میں چھوڑنے کیوں لگا۔ وجہ کیا۔ کیا دو دو عورتیں دنیا میں ہوتی نہیں ہیں۔

کلثوم بیگم :۔ اگر نہیں چھوڑتے تو پھر اسی طرح سے میرے ساتھ بھی پیش آؤ جس طرح بیویوں کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔

حکیم صاحب :۔ اس میں تو مجھ سے ابھی تک کوئی قصور نہیں ہوا۔ روز تمھارے پاس آتا ہوں کھانے پینے کو بھی جو کچھ ہو سکتا ہے حاضر کرتا ہوں اس کے سوا اور جو تمھیں کہنا ہو کہو۔

کلثوم بیگم :۔ کہنا یہ ہے کہ ایک رات یہاں رہا کرو۔ ایک رات وہاں۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرے تمھارے جو اقرار ہے اسے پورا کرو۔

حکیم صاحب :۔ اچھا یہ بھی سہی۔ میں آج سے ایسا ہی کروں گا۔ مگر وہ اقرار کون سا ہے جسے پورا کروں۔

کلثوم بیگم :۔ بس اسی بات پر تو میرے آگ لگتی ہے۔ آخر پچاس روپیہ مہینہ

کا اقرار تھا کہ نہ تھا۔

خلیا ساس:۔ ہاں یہ تو میں بھی سنتی ہوں کہ پچاس روپیہ مہینہ کا اقرار تھا۔

کلثوم بیگم:۔ اقرار کیا۔ کچھ منہ زبانی تھا اسٹام کے کاغذ پر رجسٹری ہو گئی ہے۔

حکیم صاحب:۔ دیکھیے خالہ جان بات یہ تھی کہ نکاح تو اور ہی دھوکے میں ہوا ہم کچھ اور سمجھے تھے اور وہاں کچھ اور بات نکلی۔

خلیا ساس:۔ ہاں یہ سچ ہے۔ مگر اب تو ایک شخص نے اپنی آبرو دی۔ وہ تو نگوڑی کہیں کی نہ رہی۔ اور یہ تو میں خوب جانتی ہوں کہ نباہ کسی طرح نہ ہو گا۔ اس لیے کہ اس کی طبیعت اس طرح کی ٹھہری کہ بیاہتا خصم نے رنڈی کر لی۔ اُس نے کھڑے کھڑے چھوڑ دیا۔ تم ٹھہرے بیوی کے پا مرید۔

حکیم صاحب:۔ اب تو نباہ کسی طرح کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اب تو جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ میں ہر طرح راضی ہوں آج تک رات کے رہنے کو نہیں کہا تھا۔ اب آج کہا ہے خیر یونہی سہی

کلثوم بیگم:۔ ہمارے نام پر خیر یوں ہی سہی۔ اور جو فیل کریں۔ بھائی سے چار گرگے لگا کے جوتیاں کھلوائیں ان ہی کا ابھی تک دم بھرے جاتے ہو۔

حکیم صاحب:۔ (یہ آخر کے چند فقرے کلثوم بیگم کے حکیم صاحب کے دل پر نشتر کا کام کر گئے۔ طیش کھا کے جواب دیا۔) دم کون بھرتا ہے۔ ان سے قرار واقعی کسر کی جائے گی۔ اور میاں مظہر کو تو بغیر جیل خانہ بھیجے ہوئے کھانا پینا حرام ہے جاتے کہاں ہیں میرے ہاتھ سے۔

کلثوم بیگم:۔ واہ کچھ امجد اور اماں کو تم نے جیل خانہ بھجوا دیا کچھ مظہر کو بھجواؤ گے۔

حکیم صاحب:۔ اچھا دیکھ لینا۔ اور میاں امجد کیا چھوٹ جائیں گے۔ انھوں نے تو میرے ساتھ دوہرا جعل کیا۔ مگر اس میں شرکت مرشد کی بھی تھی۔ میاں امجد اور بی اماں کا یہ دل گردہ کہاں۔ یہ ان ہی کے فقرے ہیں

کلثوم بیگم:۔ یہ مرشد کون۔ پھوپھا جان۔

حکیم صاحب:۔ جی ہاں یہ اُن ہی کا چٹکلہ تھا۔ جب ہی تو شہر میں بدنام تمام

امیر، رئیس ان کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں۔

کلثوم بیگم:۔ یہ تو تم غلط کہتے ہو۔ شہر کے امیر، رئیس تو انھیں آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ جس سرکار میں گئے اسے بنا دیا۔

حکیم صاحب:۔ کیسا کچھ۔ ایک تو چھوٹے نواب ہی کو بنا دیا۔ اسّی ہزار کی ڈگری کرا دی اور پھر وارنٹ میں پھنسوا دیا۔ وہ تو کہیے ان کی پھوپھی نے گیارہ سو روپیہ دے کے چھڑوا دیا۔ مگر بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی ہزاروں ڈگریاں ہیں۔

کلثوم بیگم:۔ چھوٹے نواب نے خود اپنا روپیہ خراب کیا۔ شرابیں پیں۔ ناچ رنگ دیکھے پریوں کے تخت اتارے۔ پھر ان حرکتوں میں روپیہ نہ صرف ہوتا تو کیا ہوتا۔

حکیم صاحب:۔ یہ سب خلیفہ جی (جن کو تم بڑے بھیا کہتی ہو) کی کارستانیاں تھیں۔

کلثوم بیگم:۔ تمھارے اُن کے تو کھُلم کھُلا عداوت ہے۔ تم تو ایسا کہو گے۔

حکیم صاحب:۔ اچھا ایک میں عداوت کی راہ سے کہتا ہوں۔ سارا شہر تھُڑی تھُڑی کر رہا ہے۔

کلثوم بیگم:۔ کوئی بھی نہیں کہتا۔ ہم نے تو تمھارے منھ سے ابھی سنا ہے۔ خود جن کا معاملہ ہے۔ یعنی چھوٹے نواب اب تک اُن کا دم بھرتے ہیں۔ اور کیوں نہ دم بھریں۔ سارا زمانہ چھوٹے نواب سے پھر گیا۔ بھیا ابھی تک آٹھ آنہ روز چنڈو کو دیے جاتے ہیں

حکیم صاحب:۔ بے شک آٹھ آنے روز چنڈو کو دیتے ہیں۔ مگر ابھی تک ایک نوٹ باقی بھی تو ہے۔ جس کے نمبر گم ہیں۔ لوگ نمبروں کا پتہ لگانے کو کلکتہ گئے ہوئے ہیں۔ اس نوٹ کا بھی خاتمہ ہو جائے پھر آٹھ آنہ روز دیں تو جانیں۔

کلثوم بیگم :۔ پھر کوئی بھی تو کسی کو بے مطلب دیتا ہے۔

حکیم صاحب :۔ یہ کہو۔ اب راہ پر آئیں حد کے جعلیے ہیں۔

کلثوم بیگم :۔ اور تم جعلیے نہیں ہو۔

حکیم صاحب :۔ میں نے کیا جعل کیا۔

کلثوم بیگم :۔ ایک جعل سیکڑوں جعل۔

اب تقریر میں رنجش زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ خلیا ساس کا دخل دینا ضروری تھا۔

خلیا ساس :۔ اچھا تمھیں پرانے جھگڑوں سے بحث کیا ہے۔ اپنی اپنی باتیں کرو۔ اس اثنا میں میاں نبی بخش دودھ لے کے آگئے تھے موم بائی اور دودھ حکیم صاحب کو پلوایا گیا۔ رات زیادہ آگئی تھی۔ آج حکیم صاحب نے یہیں آرام کیا۔

کچھ دنوں ہم سے دوستی رکھتے
دشمنوں کو بھی آزمانا تھا

آزمانا کیسا۔ آزما چکے۔ ساڑھے تین لاکھ کے نوٹ ہُر ہو گئے۔ صرف گیارہ ہزار نواب صاحب کے ہاتھ آئے مگر ابھی وہی کارخانہ ہے نوابی ٹھاٹھ میں بالکل کمی نہیں۔ اب شراب خوری زیادہ بڑھ گئی۔ پریوں کی تسخیر کا شوق زوال دولت کے ساتھ تشریف لے جا چکا تھا۔ اکسیر کے نسخوں نے کوئی کام نہ دیا۔ اور نہ ان سے کام لیا اس لیے کہ اب آنکھیں کھل چکی تھیں۔ کسی قدر نیک و بد کی تمیز ہو چکی تھی۔ شاہ جی جعلیے نکلے اس کی سب باتیں غلط تھیں۔ اکسیر کے نسخوں کا کیا اعتبار۔ سبز قبا سے مواصلت کے بعد تنفر ہو گیا۔ جن لوگوں نے دغا کی تھی اُن کی آمد و شد رفتہ رفتہ خود ہی کم ہو گئی۔ اگرچہ نواب نے کسی کو منع نہیں کیا۔ مگر اب کون آتا ہے بھاری بھاری رقمیں لے کے اپنے اپنے گھروں میں بیٹھ رہے۔ آنا کیسا۔ اگر کسی موقع پر اتفاق سے سامنا ہو گیا آنکھیں جھینپ گئیں۔ معمولی سلام کے بعد حتی الوسع اس موقع سے ٹل گئے۔ اب صرف اُن لوگوں سے راہ رسم باقی رہ گیا جنھوں نے ساڑھے تین لاکھ کے نوٹوں میں سے

کوئی حصہ نہ لیا تھا۔ گیارہ ہزار کے نصف میں شرکت تھی۔ ترتی وارنٹ حد سے سوا تھے۔ اس لیے گھر سے نکلنا قطعی موقوف تھا۔ اس زمانہ میں نواب نے شاہ گنج میں ایک مکان کرائے پر لیا تھا۔ وہیں رہتے تھے۔ ان دنوں کنکووں کا شوق پیدا ہوگیا تھا۔ گیارہ ہزار میں سے بہت سی رقم کنکووں میں اڑا دی۔ گیارہ ہزار کی اصل ہی کیا تھی وہ بھی ختم ہوئی۔ اب رہا سہا جو اثاثہ باقی تھا اس کے بکنے کی نوبت آئی یہ بھی اس گئے گزرے حال میں ہزار دو ہزار سے زیادہ کا تھا۔ کسی شاہد بازاری کا ذکر تو نہیں رکھا۔ مگر روزانہ کسی نہ کسی کا آنا ضرور تھا۔ کچھ دنوں یہ معاملہ رہا پھر بگن نامی ایک طوائف سے محبت بڑھی۔ کئی مہینہ وہ رات کو آیا کی۔ نواب اس کے مکان پر بھی جاتے تھے۔ بگن کے کمرے سے ملا ہوا خورشید کا کمرہ تھا یہاں ایک دن خورشید سے سامنا ہو ہی گیا۔ اگلی پچھلی باتیں چھڑیں۔ اس قسم کی باتیں ہوئیں جو ایسے موقعوں پر ہوا کرتی ہیں۔

خورشید:۔ کیوں نواب ہم نہ کہتے تھے۔

نواب:۔ (سر جھکا کے) تم سچ کہتی تھیں۔ سوا اس کے اس موقع پر اور کیا گفتگو ہوتی۔ خورشید کی شکایتیں سب بجا تھیں۔ مگر تلافی مافات نواب کے امکان میں نہ تھی سوا بجا اور درست کہنے کے اور چارہ کیا تھا۔ ان دنوں خورشید کا عروج تھا۔ ایک تعلق دار کی پانچ سو روپیہ ماہوار کی ملازم تھی۔ دُکڑی سواری کوئی ہزار کا گہنا ہاتھ گلے میں۔ دروازے پر سپاہیوں کا پہرا۔ چار چار مہریاں۔ دس بارہ خدمت گار۔ مامائیں اصیلیں پیش خدمتیں غرض کہ سب امیرانہ ٹھاٹھ۔ نواب جس رنڈی کے پاس جاتے تھے اس کے آگے بالکل حقیر معلوم ہوتی تھی۔

بگن ایک دبلی سی سانولی سی عورت تھی۔ کم اوقات، چھچھوری۔ بدتمیز، کچی زبان۔ بھلا اس کا اور خورشید کا کیا مقابلہ۔ کھلتی چمپئی رنگت۔ گول گول، بھرے بھرے بازو بھاری بھرکم۔ شستہ تقریر۔ ہاں ذرا سن میں بگن سے چھ سات برس بڑی تھی۔ بگن کا سن سولہ سترہ برس کا تھا۔ خورشید بیس اور پچیس کے درمیان

تھی یہ سب کچھ سہی لیکن نواب کا اگر وہ زمانہ ہوتا تو شاید بگن دو ایک روز سے زیادہ نہ بلائی جاتی۔ اور نہ اس حالت میں خورشید ہی پر زیادہ توجہ ہوتی۔ مگر اب واقعات ایسے پیچ در پیچ تھے کہ نواب بگن کے مکان پر دوڑ دوڑ کے جاتے تھے۔ وہ اکثر اوقات غمزے کرتی تھی اس موقع پر خورشید سے جو سامنا ہوا تو باہمی تعلقات کی صورت ہی اور ہو گئی

خورشید کو کچھ تو اگلی محبتوں کا خیال۔ کچھ نواب کی موجودہ حالت پر افسوس۔ اور اس کے ساتھ ترحم پھر اپنی پابندی۔ اس حالت میں بگن سے نواب کا رسم و راہ کچھ نہ کچھ ناگوار ضرور تھا۔ پھر اس سب پر طرہ۔ نواب کی بے پروائی (اس بے پروائی کا سمجھنا مشکل ہے) ہر شخص دوسرے کے دل کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ نواب نے اپنی اور خورشید کی حالت کا مقابلہ کر کے دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ اگلا تپاک ممکن نہیں۔ پہلے اس کی حیثیت ملازمت کی تھی۔ اور اب برابری بلکہ برتری کا دعویٰ ہو گا۔ پھر اس حالت میں اگر ہم دب کے ملیں بھی تو کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ اس سے اپنی آن بان رکھنا بہتر ہو گا۔ اب ہم بھی خورشید سے اس طرح ملیں کہ گویا ہم کو کوئی پروا نہیں ہے۔ ہم اپنے حال میں خوش ہیں۔ اس حالت میں بگن بسا غنیمت ہے۔ ان خیالات سے ادھر بگن خورشید کی گونہ توجہ نواب کی طرف دیکھ کے نواب سے زیادہ لپٹنے لگی۔ یہ خورشید کو اور بھی شاق ہوا۔ اب کسی قدر ضد کا مادہ پیدا ہوا۔ کیوں کیا ہم میں یہ طاقت نہیں کہ اس چھوکرے کو زک دیں۔ یہ امور جو ہم نے بیان کیے ہیں۔ اگرچہ اس کی منطق کسی قدر دقیق ہے مگر ایسے موقعوں پر یہ سب حجتیں دل ہی دل میں ہو سکتی ہیں اور اپنی اپنی حاجت کے مناسب نتیجے نکال لیے جاتے ہیں۔ عورتوں کے دلی راز ان کے جذبات اور تحریکات کا فہم بہت ہی دشوار ہے لہذا ہم صرف واقعات سے بحث کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ خورشید نے چند ہی روز میں نواب کو اپنا کر لیا۔ بگن سے اب ترک ہو گئی۔ مگر خورشید پابند تھیں۔ اس لیے چوری چھپے ملنا ہوتا تھا۔ خورشید کے دل

میں نواب کی محبت پہلے سے تھی مگر نہ اتنی کہ پانچ سو روپے کی نوکری فوراً ان کی خاطر سے ترک کر دیتی۔ نہ ایسی خواہش بھی کر سکتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ ایسا ہی ہوا۔ نواب سے جب دوبارہ رسم و راہ ہوا۔ تو سب سے پہلے یہ راز بگن پر کھلا اس کو چھپانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ بگن کو زیادہ تر اس معاملے میں کد نہ بڑھتی۔ مگر بات یہ تھی کہ نواب بگن کے کمرے سے اُٹھ کے اکثر خورشید کے مکان میں چلے جایا کرتے تھے۔ کیوں کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ دروازے پر پہرہ رہتا تھا ایک دن سوء اتفاق سے بگن نشہ میں تھی۔ اس حالت میں نواب اس کے پاس سے اُٹھ کے خورشید کے کمرے میں جانے لگے۔ بگن نے دامن پکڑ لیا۔

بگن:۔ میں تو نہ جانے دوں گی۔

نواب بھی نشے میں تھے۔ دامن چھڑانے لگے اس بحث میں نواب کا نیا شربتی کا انگرکھا نکل گیا نواب پھر اٹھ کے جانے لگے دیوار پر سے ہو کے راستہ تھا۔ نواب دیوار پر چڑھ رہے تھے کہ خورشید نے ٹانگ پکڑ کے گھسیٹی۔ یہ دھم سے گر پڑے۔ سخت چوٹ آئی اس غصے میں نواب نے ایک طمانچہ بگن کو مارا اور ہاتھ سے دھکیل کے خورشید کے مکان میں چلے گئے۔ بگن چیخیں مار مار کے رونے لگی۔ اس کے بعد خورشید کو گالیاں دینا شروع کیا۔ خورشید نے بہت تحمل کیا۔ مگر پھر بھی عورت ذات کہاں تک چپ رہتی۔ آخر وہ بھی جواب دینے لگی۔ رفتہ رفتہ وہ غضب کی لڑائی ہوئی کہ بھٹیاریاں مات ہو گئیں۔ چوک میں لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ دو بجے تک دونوں طرف سے گالی گلوج ہوا کی۔

دوسرے دن تعلق دار صاحب کو پتہ لگا۔ انھوں نے خورشید کو فوراً برطرف کر دیا۔ چلیے میدان خالی ہو گیا۔ مگر خورشید کو اس نوکری کے چھوٹ جانے کا کچھ زیادہ ملال نہ ہوا نہ ایسے لوگوں کو ملال ہوتا ہے اس لیے کہ ایسے لوگوں کے اکثر خریدار ہوتے ہیں جب سے ہوش سنبھالا کوئی مصیبت پڑی نہیں ہمیشہ عیش میں کٹی اور غرہ یہ ہے کہ جس مرنے والے سے جو کہہ دیں گے وہ ہو جائے گا اور ایسا اکثر ہوتا بھی

ہے۔ ادھر نواب نے حد سے زیادہ اطاعت کرنا شروع کی۔ چند ہی روز کے بعد شہر بھر کو معلوم ہو گیا کہ نواب خورشید کے گھر پڑ گئے۔

بعد از خرابی بصرہ ایک دن حکیم صاحب اپنے حساب کتاب کو دیکھ رہے تھے۔ عمدہ خانم والے مکان کا رہن نامہ بھی اس میں سے نکل آیا۔ حساب لگایا۔ تو ساڑھے سترہ مہینے کا کرایہ چڑھا ہوا تھا نبی بخش کو آواز دی۔

نبی بخش:۔ حضور۔

حکیم صاحب:۔ نبی بخش جاؤ تو آج عمدہ خانم سے کرایہ تو وصول کر کے لاؤ۔ کہنا کہ ساڑھے سترہ مہینے چڑھ گئے ہیں۔ اب زیادہ کی ہم کو گنجائش نہیں ہے فوراً کرایہ دے دیجیے اور مکان کو خالی کر دیجیے۔ اس میں کوئی کرایہ دار رکھ دیا جائے۔ کیوں کہ آپ سے کرایہ ادا نہ ہوگا۔ ورنہ ہم نالش کر دیں گے۔

نبی بخش:۔ بہت خوب تو ابھی جاؤں۔

حکیم صاحب:۔ اور کب؟

نبی بخش:۔ ابھی تو افیم نہیں کھائی ہے۔

حکیم صاحب:۔ اے لو افیم کھا لو۔ کیا افیم کھانے میں کچھ دیر لگتی ہے۔

نبی بخش:۔ دیر تو نہیں لگتی ہے۔ مگر آپ سے کہہ دینا اچھا ہے اس لیے کہ شاید آتے آتے ذرا دیر لگ جاتی تو آپ خفا ہوتے۔

حکیم صاحب:۔ اچھا تو کب تک آجاؤ گے۔

نبی بخش:۔ اے یہی کوئی دو گھنٹہ میں۔

حکیم صاحب:۔ آج تم نے دن بھر کی فرصت کی۔

نبی بخش:۔ جی نہیں جلدی آؤں گا۔

حکیم صاحب:۔ ہاں یعنی کوئی چار بجے تک۔

نبی بخش:۔ اے حضور دوپہر تو یہیں ہو گئی ہے۔

حکیم صاحب:۔ دوپہر۔ ابھی دس بجے ہیں۔

نبی بخش:۔ دس بجے ہیں۔ میں کہتا ہوں گیارہ کب کے بج گئے بلکہ بارہ کا عمل ہے۔

حکیم صاحب:۔ گھڑی میں دس بجے ہیں۔ تم کہتے ہو بارہ کا عمل ہے۔

نبی بخش:۔ اے حضور صاحب عالم کے یہاں کے گھڑیال سے کوئی گھنٹہ بھر ہوئے میں نے پوچھا اس نے کہا گیارہ بج گئے۔ خدا جانے آپ کی گھڑی کیسی ہے۔

حکیم صاحب:۔ جی ہاں تمھیں شہزادہ صاحب کے گھڑیال پر اعتبار ہوگا۔ اور ہماری گھڑی کا اعتبار نہیں ہے۔

نبی بخش:۔ تو کیا گھڑیال غلط ہے؟

حکیم صاحب:۔ گھڑیال کا کیا اعتبار۔ وہ تو شہزادہ صاحب کی سلامتی مناتا ہے۔ گھڑیال اونگھا کرتا ہے جب اونگھتے اونگھتے چونکا۔ جو اس کے جی میں آیا بجا دیا۔

نبی بخش:۔ درست ہے۔ مگر بادشاہی سے اس وقت تک سارے زمانے کا کام اس پر چل رہا ہے۔ اور یہ گھڑی گھنٹہ کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ بادشاہی میں کہیں بڑے بڑے امیروں کے پاس گھڑیاں تھیں اور یہ بڑی مہنگی آتی تھیں اب جیسی یہ گھڑیاں نکل پڑی ہیں۔ جس کو دیکھو ایک گھڑی پانچ روپے کی لے لی ایک پیتل کی زنجیر ڈال کے لٹکا لی اکڑتے چلے جاتے ہیں بھلا یہ پانچ پانچ روپے کی گھڑیاں کیا ٹھیک وقت بتائیں گی۔

حکیم صاحب:۔ اب تمھاری حجتوں کا کون جواب دے۔ پانچ روپے والی گھڑیاں بھی خوب چلتی ہیں اور یہ میری گھڑی خاص انگلش ہے۔ ایک منٹ کا کبھی فرق نہیں پڑتا۔

نبی بخش:۔ جی ہاں۔ مگر جب سے آپ نے نیلام میں لی ہے۔ کئی پانچ روپے تو میرے ہاتھوں گھڑی ساز لے چکا ہے۔ بس ایسی گھڑی ہے۔ گھڑی بغیر آٹھ سات سو والی کے ٹھیک ہوتی ہی نہیں۔

حکیم صاحب نبی بخش کی خصلت سے خوب واقف تھے کہ جب یہ بحث کرتے

ہیں۔ کسی سے بند ہوتے ہی نہیں اور حکیم صاحب کو بھی ان کے ساتھ تقریر کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔ مگر اس وقت حساب کتاب دیکھ رہے تھے۔ بہر صورت انھیں ٹالنا منظور تھا۔ چپ ہو رہے۔

نبی بخش:۔ اچھا تو اب میں جاتا ہوں۔ تمباکو، گوشت، ترکاری کے لیے پیسے دیجیے ادھر ہی سے لیتا آؤں گا۔

حکیم صاحب:۔ (حساب دیکھنے میں مصروف تھے) یہ سب پھر لے آنا۔ اس وقت تو جاؤ۔

نبی بخش:۔ اے حضور۔ آپ کو دو دو دفعہ ٹانگیں تڑوانے سے کیا فائدہ۔ دے بھی دیجیے بیگم صاحب سے صندوقچہ مانگ لاؤں۔
خلاصہ یہ ہے کہ خدا خدا کر کے نبی بخش ٹلے۔

اس وقت کے گئے گئے شام کو پلٹ کے آئے تو یہ خبر لائے۔

نبی بخش:۔ اس مکان میں تو کوئی جواب ہی نہیں دیتا۔ جیسے کوئی رہتا ہی نہیں۔

حکیم صاحب:۔ پھر تم اندر گئے تھے۔

نبی بخش:۔ اندر کیوں کر جاتا۔

حکیم صاحب:۔ کیوں کیا باہر سے قفل لگا تھا۔

نبی بخش:۔ جی نہیں۔ قفل تو نہ تھا۔

حکیم صاحب:۔ پھر اندر چلے گئے ہوتے۔

نبی بخش:۔ اندر کیوں کر جاتا۔ پرائے مکان میں درانہ گھس جاتا۔

حکیم صاحب:۔ پرایا مکان کیسا۔ مکان ہمارا ہے یہ حکیم صاحب نے اس لیے کہا تھا کہ آپ کو یہ یقین تھا کہ عمدہ خانم بیچاری سے نہ زرِ رہن ادا ہو سکے گا نہ کرایہ۔ بعد انقضائے مدت رہن دعویٰ کر دوں گا۔ مکان کو نیلام پر چڑھوا کے اپنے نام چھڑوا لوں گا۔ ایسے معاملے حکیم صاحب نے بہت سے

کیے تھے۔

نبی بخش:۔ وہ آپ ہی کا سہی۔ مگر میں تو اندر نہیں جا سکتا۔

حکیم صاحب:۔ بیسیوں مرتبہ میرے ساتھ گئے ہو۔

نبی بخش:۔ آپ کے ساتھ جانے کی اور بات ہے آپ جہاں جائیے گا میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔

میاں نبی بخش کی منطق ایسی نہ تھی کہ حکیم صاحب فوراً اس کی تردید کر سکتے۔ اور اس وقت ایک واقعہ کی تحقیق منظور تھی۔

حکیم صاحب:۔ پھر تمھیں کیوں کر معلوم ہوا کہ مکان خالی پڑا ہے۔

نبی بخش:۔ کئی دفعہ آواز دی۔ کنڈی کھڑکھڑائی دروازہ زور سے کھٹ کھٹایا۔ کوئی ہوتا تو بولتا نہ۔

حکیم صاحب:۔ عمدہ خانم کوٹھے پر رہتی ہیں۔ وہاں تک آواز نہ گئی ہوگی۔

نبی بخش:۔ جی ہاں کیا بہری ہیں۔

حکیم صاحب:۔ یہ دیکھا ہوتا کہ کنڈی اندر سے بند تھی یا نہ تھی۔

نبی بخش:۔ یہ تو میں نے نہیں دیکھا۔

حکیم صاحب:۔ بس یہی تو تمھاری حرکتیں ہیں۔ جس کام کو جاتے ہو۔ کبھی پورا کر کے نہیں آتے گئے تھے تو یہ بھی دیکھ لیتے۔

نبی بخش:۔ یہ آپ نے کہا تھا۔

حکیم صاحب:۔ لاحول ولاقوۃ۔ اتنی تمھیں عقل نہ تھی۔

نبی بخش:۔ اتنی عقل ہوتی تو پھر تین روپے مہینہ کی نوکری کیوں کرتے۔ ہم بھی نہ آپ کی طرح مسند پر بیٹھے ہوتے۔ اچھا اب دیکھ آؤں۔

حکیم صاحب:۔ جی ہاں صبح کے گئے گئے تو اب آئے ہو۔ اب کہیں گئے تو کل آؤ گے۔ یہاں وہاں دونوں جگہ کا سودا سلف کرنا ہے۔

نبی بخش:۔ پھر یہ آپ جانیے۔

حکیم صاحب:۔ اچھا تو کل میں خود جاؤں گا۔ دیکھوں تو ماجرا کیا ہے۔

دوسرے دن حکیم صاحب بہ نفس نفیس تشریف لے گئے۔ آوازیں دیں۔ کنڈی کھڑکھڑائی تمام محلے کو خبر ہو گئی مگر اس مکان سے کسی کی آواز نہ آئی۔ مکان کی کنڈی کھلی ہوئی تھی اندر چلے گئے۔ اِدھر اُدھر دیکھا کوئی نہ تھا پہلے اس کوٹھے پر گئے جہاں اکثر جایا کرتے تھے۔ جب بیگم صاحب سے تعلقات بڑھائے جاتے تھے۔ پھر اِدھر اُدھر سے اوپر کے دوسرے کوٹھے پر چڑھے۔ زینے پر سے کسی کے بولنے کی صدا آئی۔ اوپر کے زینے سے کوٹھے کے قدم رکھا ہی تھا۔ کسی نے چلا کے کہا کون ہے۔ یہ آواز عورت کی تھی۔

حکیم صاحب:۔ کوئی نہیں۔ میں ہوں۔

وہ آواز:۔ آپ کون صاحب ہیں زنانہ مکان میں درانہ چلے آئے۔

حکیم صاحب:۔ کیا کریں کل سے آدمی پھر پھر جاتا ہے کوئی مکان میں بولتا ہی نہیں۔ آخر آج میں خود آیا عمدہ خانم کہاں ہیں۔

آواز:۔ کون عمدہ خانم؟

حکیم صاحب:۔ کون عمدہ خانم۔ جن کا یہ مکان ہے۔

آواز:۔ مکان میر صاحب کا ہے۔ عمدہ خانم کون ہوتی ہیں اُن کا تو نام تک ہم نے نہیں سنا۔

حکیم صاحب:۔ میر صاحب کون؟۔

آواز:۔ یہی میر صاحب بڑے میر صاحب کے بیٹے۔ ابھی کہیں باہر گئے ہیں آتے ہوں گے اچھا آپ باہر جائیے۔ جب وہ آئیں گے تو ان سے پوچھیے گا آخر کی چند لفظیں اس لب و لہجہ سے ادا ہوئی تھیں کہ حکیم صاحب کو بغیر کوٹھے سے اترے چارہ نہ تھا نیچے اترے دروازے کے پاس تھوڑی دیر توقف کیا۔ فکر کرنے لگے کہ آخر اب کس عمدہ خانم کو دریافت کروں معلوم

ہوتا ہے عمدہ خانم نے کسی کو کرائے پر رکھ دیا ہے۔ یہ لوگ کرایہ دار ہیں۔ یہ ابھی یہیں تھے کہ باہر سے کسی کے آنے کی آہٹ معلوم ہوئی۔ آنے والے نے دروازے کے اندر قدم رکھا کہ حکیم صاحب سے سامنا ہوا دیکھا واقعی بڑے میر صاحب کے بڑے بیٹے ہیں۔

میر صاحب (نے نگاہِ کرم سے حکیم صاحب کی طرف دیکھ کے) خیر باشد۔

حکیم صاحب:۔ جی خیریت ہے۔ عمدہ خانم کے پاس آیا تھا۔ آہا ہا۔ آپ اس مکان میں کرائے پر رہتے ہیں۔

میر صاحب:۔ خدا کے فضل سے آج تک تو میں کرائے کے مکان میں نہیں رہا۔ مکان میرا ذاتی ہے۔ اور آپ کی بے تکلفی نے بھی قیامت کی۔ زنانہ مکان میں آپ کیوں تشریف لے گئے۔ والد سے اور آپ سے ملاقات ہے مجھ سے تو آپ سے اس قدر راہ رسم بھی نہیں۔ یہ آپ نے کمال کیا۔

حکیم صاحب:۔ جناب معاف کیجیے گا۔ میں عمدہ خانم کے پاس آیا تھا۔ جن کا یہ مکان ہے۔ بلکہ میرے پاس رہن ہے۔

میر صاحب:۔ یہ عمدہ خانم کون بلا ہیں۔ مکان میرا ہے۔ یہ آپ فرماتے کیا ہیں

حکیم صاحب:۔ میں صحیح عرض کرتا ہوں۔

میر صاحب:۔ اچھا صحیح ہو یا غلط مگر باہر تشریف رکھیے فرمائیے تو کچھ بیٹھنے کو منگوا دیا جائے۔ کیوں کے آپ والد کے احباب میں سے ہیں۔ گو مجھ سے چنداں تعارف نہیں۔

حکیم صاحب:۔ (بات کے پہلو کو سمجھ گئے) تو یہ مکان آپ کا ہے؟

میر صاحب:۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس بات کے مکرر استفسار کرنے سے آپ کو کیا نفع ہو گا مگر میں تعمیل ارشاد کرتا ہوں۔ جی ہاں میرا مکان ہے ذاتی۔ بلا شرکت غیر و مزاحمت احدے۔ اگر آپ حکم دیجیے تو قبالہ بھی حاضر کیا جائے۔

حکیم صاحب :۔ بڑے میر صاحب نے مول لیا تھا۔

میر صاحب :۔ جی نہیں بڑے میر صاحب کا نہیں ہے۔ اور یوں تو ہاں انھیں کا ہے میں خود ان کا ہوں۔ مگر یہ مکان میں نے اپنے ذاتی روپیہ سے مول لیا۔

حکیم صاحب :۔ کس سے مول لیا۔

میر صاحب :۔ اب اس کا جواب میں یہاں نہ دوں گا۔ معاف کیجیے گا۔

حکیم صاحب :۔ اچھا تو میں جاتا ہوں۔

میر صاحب :۔ میں تو نہیں عرض کر سکتا۔ تشریف رکھیے کچھ بیٹھنے کو منگایا جائے۔ حقہ بھروا منگواؤں۔

حکیم صاحب نے دیکھا کہ اس خشک مدارات سے کوئی اور نفع نہیں۔ لہٰذا اب گھر ہی چلنا مناسب ہے۔

نبی بخش :۔ (جب تک مکان کے اندر رہے اور میر صاحب سے باتیں ہوا کیں۔ غور سے سنا کیے۔ ایک لفظ نہ بولے۔ باہر نکل کے) یہ کیسی بات ہوئی؟

حکیم صاحب :۔ (اگرچہ بولنے کو جی نہ چاہتا تھا مگر جواب ہی دینا پڑا) آپ ہی دیکھیے یہ میاں امجد کا دوسرا جعل نکلا آپ ہی ان کو لائے۔

نبی بخش :۔ جی ہاں آپ تو کہیے ہی گا میں لایا تھا کہ آپ نے بلوایا تھا۔

حکیم صاحب :۔ (بات سچی تھی جواب کیا دیتے) ہاں میں نے بلوایا تھا۔

میاں نبی بخش کو کیا غرض تھی کہ بغیر قیل و قال بحث و مباحثہ اتنا بڑا الزام اپنے ذمہ لیتے اس لیے کہ یہ بہت ہی کھرے آدمی تھے۔

نبی بخش :۔ یہ آپ نے کیا کہا میں بلا لایا تھا آپ ہی نے ان لوگوں کو گھیرا میں تو جانتا ہی تھا وہ مہری ایک چھٹی ہوئی ہے۔ اور امجد کو تو میں اس زمانے سے جانتا ہوں جب وہ لنگوٹی باندھے پھرتا تھا۔ ایک ہی فتور یہ لونڈا ہے میرا بس ہوتا تو ایسے لوگوں کو گھسنے بھی نہ دیتا۔

حکیم صاحب :۔ میاں عجب آدمی ہو پہلے تم ہی تعریفیں کیا کرتے تھے۔ اب

یوں کہتے ہو۔

نبی بخش :۔ تعریفیں نہ کرتا تو کیا کرتا۔ آپ انھیں بلاتے تھے۔ پھر میں ان سے کیوں برا ہوتا منھ پر کوئی بھی کسی کو برا کہتا ہے۔

حکیم صاحب :۔ تم نے ان کے منھ پر نہ کہا تھا اُس پیچھے ہم سے کچھ ان کا حال تو کہہ دیا ہوتا

نبی بخش :۔ کیا آپ نہیں جانتے تھے؟

حکیم صاحب :۔ میں جانتا تھا کہ ایسے جھلیے ہیں۔

نبی بخش :۔ تو یہ روپیہ جو آپ نے گروی کا دیا ہے۔ وہ کہیں نہیں گیا ہے۔

حکیم صاحب :۔ گیا نہیں تو اب کیا ملتا ہے۔ چھ سات سو روپے پر پانی پھر گیا۔

نبی بخش :۔ یہ قسمت کی بات ہے۔

ہم بھی ہیں مختار لیکن اس قدر ہے اختیار
جب ہوئے مجبور قسمت کو برا کہنے لگے

ختم ہے داستاں مگر رُسوا
ایک نئی بات جی میں آئی ہے

ان واقعات کے دس بارہ برس کے بعد چھوٹے نواب صاحب سے ملاقات ہوئی۔ پرانے حیدر گنج میں فروکش ہیں۔ روپیہ سوا روپیہ ماہوار کرائے کا مکان ہے مال دنیا سے سوا پارچہ بوریا۔ مندرس ایک عدد۔ ٹین کا لوٹا ایک عدد اوندگلی دو عدد سبوچہ گلی۔ ۲ عدد اس کے سوا مکان میں کچھ نظر نہ آیا۔ ہاں ایک طرف گوشے میں ایک بوتل بھی رکھی ہوئی تھی مگر بہ تحقیق معلوم ہوا کہ وہ مال سرکار کا نہیں۔ عندالضرورت کلوار خانے سے مستعار آجاتی ہے۔ رفقائے قدیم سے اب کوئی باقی نہیں صرف ایک بڑی اتا جی کا دم ہے۔ وہی شب و روز خدمت گذار ہیں۔ دوست احباب میں کوئی پاس نہیں پھٹکتا۔ الّا اس حالت میں جب کسی شامت کے مارے کو بہ ضرورت اپنے گھر سے ایک شب کے لیے غائب ہو جانا مقصود ہوتا ہے

اور کوئی جگہ فی الفور نہیں ممکن ہوتی تو آپ ہی کے دولت سرا پر بے تکلف چلا جاتا ہے۔ اس حالت میں ضرور ہے کہ جہاں اپنے واسطے کھانے پینے کی فکر کرے۔ نواب صاحب اور ان کے متعلقین کا بھی خیال رکھے۔ ورنہ کیا ضرور ہے کہ نواب صاحب اس کے لیے اپنے اوقات عزیز کو صرف کر کے اشیائے مطلوبہ فراہم کریں۔ یا محلے سے چارپائی مانگتے پھریں۔ دو ایک جوڑے کپڑے جو وقتاً فوقتاً بعض اعزا یا احباب نے بہ صیغہ ایثار و کرم نذر گزراتے ہیں ان میں سے جن کی ضرورت بالفعل نہیں ہوتی۔ وہ اکثر کلوار خانے میں اور احیاناً بنیے کی دوکان پر بہ طور امانت رہتے ہیں۔ مگر طبیعت نواب صاحب کی تربیت پذیر تھی۔ اس لیے استادوں نے جن فنون کے ذریعے سے آپ سے اخذ زر کیا اُس کی بہت کچھ لیاقت آپ کو بھی حاصل ہو گئی ہے مگر مستی و مے خواری اس کے عمل درآمد کی زیادہ فرصت نہیں دیتی جس دن نواب صاحب کو پنشن یا وثیقہ ملتا ہے۔ اگرچہ اس کے مجموعہ کی مقدار جمع قاف سے بھی اقل ہے لیکن ایک دو دن کے لیے نوابی کارخانہ ہو جایا کرتا ہے۔ خورشید سے ملاقات کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے اس کے بعد ایک اور زن بازاری سے کئی سال لطف رہا اور اس نے بھی کچھ دنوں خوب ساتھ دیا۔ اس کے محاصل کی مقدار نواب صاحب کے وثیقہ پنشن سے چند در چند زیادہ تھی۔ اور وہ سب آپ ہی کے مصرف میں آتی مگر جہل بسیط اور مرکب اور اس کے اور شعبے جو اس کو لازم ہیں مثل بیخودی و خودغرضی وغیرہ کے آپ نے کئی لاکھ کی دولت کھو کے حاصل کیے ہیں اس لیے ممکن نہیں کہ آپ سے کسی سے دوستی نبھ سکے اس لیے کہ یہ جوہر ممکن نہیں کہ کبھی نہ کبھی کھل نہ جائیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اُس سے بھی ترک ہو گئی۔ بڑی اتا جی کی رفاقت بہت کام آئی اور ابھی کچھ دنوں اور کام آئے گی۔ والدہ آپ کی کربلا تشریف لے گئی تھیں۔ پھر نہیں معلوم کہاں مفقود ہو گئیں۔

ایک زمانے میں آپ نے اپنے احباب خاص کو یہ چکمہ بھی دیا تھا کہ والدہ نے میرے کچھ نوٹ گھما دیے تھے ان کا پتہ لگائیے مگر آپ کے رفقائے قدیم

نے اس فقرے پر بل نہ چڑھنے دیا اور کسی کو آپ پر اعتنا نہ ہوئی کچہری کے کاروبار میں بھی آپ کو کچھ دخل ہے۔ جس محلے میں آپ تشریف رکھتے ہیں وہاں کے اہل پولیس سے بھی اکثر یہ معاملہ رہتا ہے۔

تم ہمیں پوچھو نہ پوچھو ہم تمھارے دوست ہیں
فخر کرنے کے لیے اتنا تعلق کم نہیں

اتنا تعلق غریب محلہ والوں کو دھمکانے کے لیے کافی ہے۔ اگر کسی سے کوئی گستاخی ہوگئی اور نواب صاحب زیادہ نشہ میں ہو گئے "واللہ تھانے دار صاحب سے کہہ کے محلے سے نکلوا دوں گا۔ بیچارے غریب ناواقف ممکن ہے کہ ایسے فقروں سے دو ایک مرتبہ لرز جائیں مگر جب اس کی تکرار کئی بار ہوئی اور اس کا کوئی نتیجہ مترتب نہ ہوا تو لوگ سمجھ گئے غرض کہ جو رعب جمانا چاہا تھا نہ جما جب حکومت جعل میں بدعمل ہوگئی خوشامد سے کام چلتا رہا۔ اس فن کی بدولت نواب صاحب کو اکثر فوائد ہوئے اور اگر یہی وضع رہی تو ہوتے رہیں گے کچھ نواب صاحب پر موقوف نہیں بلکہ اکثر جاہل امرا زادوں کا یہ شیوہ ہے کہ جو لوگ ان کی آبائی عزت کے خیال سے ان کے ساتھ کسی قسم کی مراعات کرتے ہیں تو وہ بجائے اس کے کہ اُس کے ممنون ہوں اس رعایت کو اپنا حق تصور کرتے ہیں اس وجہ سے نخوت بڑھتی جاتی ہے اور وہ طرح طرح کی خرابیوں کا باعث ہوتی ہے۔

اب ہم اس افسانے کو ختم کرتے ہیں۔ اور بر سبیل اختتام صرف اس قدر گزارش اور باقی ہے کہ یہ افسانہ اور اس کے علاوہ اور ناول ہم نے تحریر کیے ہیں ان میں کسی میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہے جس سے دل و دماغ پر کوئی شدید اثر مثل ہول یا خوف یا رقت وغیرہ کے طاری ہو سکے کیوں کہ اصل منشا ہمارا اس افسانہ نویسی سے نظام معاشرت کے واقعات کی فراہمی ہے۔ ہمارے ناول نہ ٹریجڈی ہیں نہ کمیڈی نہ ہمارے ہیرو تلوار سے قتل ہوئے نہ ان میں سے کسی نے خودکشی کی نہ ہجر ہوا نہ وصال۔ ہمارے ناولوں کو موجودہ زمانے کی تاریخ سمجھنا چاہیے

امید ہے کہ یہ تاریخ بکار آمد ثابت ہو اور لوگ ہمیں دعائے خیر سے یاد کریں۔

مرزا رُسوا

مرزا رسوا کے

تنقیدی مراسلات سے

انتخاب

اگلے زمانہ سے شاعری کی مدح و ذم میں بہت کچھ افراط و تفریط کی گئی ہے مدح کی انتہا تو یہ ہے کہ یہ مصرعہ مشہور ہے۔ ع

شاعری جزوے ست از پیغمبری

اور ذم میں مثلاً ؎

در شعر و ہیچ در فن او چوں اکذبِ اوست احسنِ او

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ شعر اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔ میں اور حیثیات سے قطع نظر کر کے صرف یہ کہتا ہوں کہ بعض اشعار اخلاق کے لیے مفید ہیں اور بعض مضر، مثلاً وہ اشعار جن میں اخلاقی مضامین ہوں وہ قسم حسن میں داخل ہیں اور جن میں نفس پرستی کے مضامین ہوں وہ قبیح ہیں۔ لیکن ہمارے اور ہمارے بعض معاصرین کے بعض اشعار (بلکہ ہمارے اکثر اشعار) ان دونوں صفتوں سے معرّا ہیں نہ ان میں کوئی حسن ہے نہ قبح۔ لہذا ایسے شعر نہ اس مدح کے لائق ہیں اور نہ ذم کے۔ ایسے شعر کہنا ایک فعل عبث ہے۔

مصرعہ۔ شاعری جزوے ست از پیغمبری

یعنی مضامین القائی اور الہامی ہوتے ہیں۔ اب میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ مضامین القائی و الہامی سے کیا مراد ہے۔

آپ ہی انصاف سے دیکھیے کہ جس قسم کے اشعار آج کل ہمارے گُل دستوں میں شائع ہوتے ہیں کیا وہ ع

شاعری جزوے ست از پیغمبری

کے مصداق ہو سکتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ اس کا ایک سبب کم علمی ہے۔ علم سے میری مراد بہت سی کتابیں پڑھ لینا یا کم از کم سلسلہ نظامیہ کو کسی نہ کسی طور سے تمام کر لینا نہیں ہے۔ عقل اور فطرت تحصیل علم کے لیے کافی ہے مگر عقل سے کام لینا اور فطرت میں تصرف کرنا کسی قدر محنت چاہتا ہے۔ اور اس کی ہمیں فرصت نہیں۔ جس قدر مضامین پیش پا افتادہ تھے ان کو اگلے کہہ گئے اب ہماری استادی صرف اس سے استنباط کرنے میں صرف ہوتی ہے اور اگر اس کا سلیقہ بھی ہم کو نہیں تو ان کو اور خراب کرتے ہیں۔ ہماری شاعری سماعی اور کتابی ہے نہ نظری۔ ہم خود فطرت کا مشاہدہ کر کے غور کرنے اور کتاب فطرت سے مضامین پیدا کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ اگلوں کے مضامین کو اپنے لفظوں میں دہرا دینا ہمارا خاص کام ہے اور اسی پر ہمیں فخر ہے۔

علم طبعیات، الٰہیات اور شعر بہ ظاہر ان کے مقاصد جدا جدا ہیں اور شاعر کو حکیم سے اول مرتبہ پر رکھا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ حکیم سے وہ کام نہیں ہو سکتا جس کو شاعر نازک خیال انجام دے سکتا ہے فطرت سے دقیق مضامین کو اخذ کرنا اور اس کو فہم عام اور موثر الفاظ میں کہہ جانا خاص شاعر ہی کا کام ہے۔ اور کسی سے نہیں ہو سکتا۔ میں اس سے بھی زیادہ ترقی کر کے کہتا ہوں کہ حقائق اور معارف کو جس پیرایہ سے شاعر ادا کر سکتا ہے فلسفی کی مجال نہیں کہ اسے بیان کر سکے۔ خیال کے آئینہ خانے میں عالم جبروت کی جھلک نظر آتی ہے۔ پیاری پیاری صورتیں متجسم ہوتی ہیں اور صوت و حرف کے ذریعہ سے سامعہ تک پہنچتی ہیں۔

شاعر کی وسعت مثل قسمت عالم کے لامتناہی ہے۔ اس کا جولان گاہ

فلسفہ کی حد رسائی سے کہیں آگے ہے۔ جن امور کو فلسفہ نے اب ثابت کیا ہے شاعروں کی تخیل کئی قرن پہلے ان کو پا چکی ہے۔ شاعر اعلیٰ رموز حکمت کو اس طرز دل آویز سے کہہ جاتے ہیں کہ فلسفی کو ان کے بیان کرنے کے لیے بڑی بڑی دقتیں پیش آتی ہیں۔ تمہید مطالب اور ترتیب مقدمات میں بہت سا وقت صرف ہو جاتا ہے اور پھر بھی جیسا چاہیے وہ امر ذہن نشین نہیں ہوتا۔ شاعر کی زبان میں خداداد اثر ہوتا ہے مگر "ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ" جس طرح کوئی شخص اپنی کوشش سے حسین نہیں ہو سکتا اُسی طرح فطرت سلیم بھی بنائے سے نہیں بنتی دیکھا گیا ہے کہ اکثر صاحب شعر کہتے کہتے بوڑھے ہو گئے مگر کوئی شعر مزے کا نہ نکلا اور ایک طفل مکتب نے وہ شعر پڑھ دیا کہ مشاعرہ الٹ گیا۔

ممکن ہے کہ میری اس تقریر سے بعض نوعمر شاعر بے دل ہو جائیں اس لیے کہ جب شاعری امر خداداد ہے تو پھر اس کا اکتساب غیر ممکن ہو گیا لہٰذا ہر شخص کو جو شعر کہنا چاہے یہ دریافت کرنا ضروری ہے کہ آیا اس کی طبیعت اس کے مناسب ہے یا نہیں۔ اس موقع پر صرف یہ سمجھ لینا چاہیے کہ فطرت نے ہر انسان کو اواسط استعدادات عطا کیے ہیں۔ فطرت کے قواعد کلیہ میں اتفاقات اور عوارض کو بہت کم دخل ہے۔ حد خاص سے زیادہ خوب صورت اور حد خاص سے زیادہ بدصورت بہ مشکل مل سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک، مزاج اور عادت کو بھی اس امر میں بہت کچھ لگاؤ ہے۔ فطرت نے ہر ملک کے مناسب ایک صورت خاص اور ایک طبیعت مخصوص ہر باشندہ کو عنایت کی ہے۔ انگشت نمائی کے لائق معدودے چند ہوتے ہیں۔ اگر فطرت نے کسی کو موزوں طبع نہیں پیدا کیا تو وہ ہرگز شعر موزوں کرنا کیسا موزوں پڑھ نہیں سکتا۔ مگر ایسے ناموزوں طبیعت والے مشکل سے ملیں گے۔ لہٰذا اوسط درجہ کے دماغ والے اکثر موزوں طبع بھی ہوا کرتے ہیں۔ مگر اکثر استعدادات بہ سبب عدم مزاولت کے ضائع ہو جاتے ہیں یا بہ سبب عدم علم کے ابتدا خراب

ہو کر درستی کے قابل نہیں رہتے۔ جو لوگ ابتدا میں کسی کامل استاد سے موسیقی نہیں حاصل کرتے اور ابتدا ہی میں سُر بیورہ ٹھیک نہیں کر لیتے ان کو بد آواز اور بے اصول گانے کی مشق ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہر مبتدی کو اپنی ابتدا کی درستی کا خیال نہایت ہی ضروری ہے اگر طبیعت ابتدا ہی میں خراب ہو گئی تو استاد کامل کی کوششوں سے بھی کوئی اثر مرتب نہ ہو گا۔ مثلاً ہمارے شہر کے اکثر شعراء اور ان کے تلامذہ کو مناسبات الفاظ کا لحاظ حد سے زیادہ ہے۔ اگرچہ یہ ایک صنعت شعری ہے اور محسنات کلام میں داخل ہے مگر اب سلیقہ شعر اس کو عیوب شعر میں شمار کرنے لگا ہے اور اس بد عادت کا اثر اس قدر شائع و ذائع ہو گیا ہے، کہ اب اس کا ترک من قبیل محالات سمجھا جاتا ہے اسی طرح بعض تشبیہات جو کسی اگلے استاد نے کسی موقع پر نظم کر دیے تھے۔ اب اس کی کثرت سے چھتاڑ کی گئی ہے کہ سننے والوں کو ان سے نفرت ہو گئی اور نفرت کی وجہ یہ ہے :۔

اولاً یہ غور کرنا چاہیے کہ :۔

تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل کنایہ اور صنائع و بدائع معنویہ و لفظیہ یہ سب مجموعاً و کلیۃً کیوں باعث لذت ہوتے ہیں؟ اس مسئلہ کا جواب ہم کو علم نفس سے مل سکتا ہے جس کو ہم ابھی بیان کریں گے پہلے اتنا کہہ لینے دیجیے کہ اگر وہ شرائط (پوری نہ ہوں تو ان سے پیدا شدہ صورت) یعنی لذت بھی فوت ہو جائے گی۔

واضح رائے عالی ہو کہ ان امور میں صرف قوت باعث لذت ہے یعنی قائل کا قول سامع کے لیے صرف قوت کا باعث ہوتا ہے۔ قوت سے یہاں قوت ذہنی مراد ہے۔ توجیہہ مزید اس کی یہ ہے کہ انسان میں دو سبب لذت کے ہیں۔

(۱) استعمال قوے بحالتِ صحت۔

(۲) ارتفاع الم۔ اور وہی استعمال قوٰی ایک حد خاص سے تجاوز کرنے کے بعد موجب الم ہو جایا کرتا ہے۔ اس صورت میں ترک فعل ضروری ہو جاتا

ہے۔ اور یہ دوسری قسم میں داخل ہے یعنی ارتفاع الم میں۔

تشبیہات غریب و بعید کے سننے کے بعد سامع کو قوت فکر کے استعمال کا موقع ملتا ہے اور یہی موجب لذت ہوتا ہے۔ تشبیہہ کی ندرت ایک استعجاب خاص کا باعث ہوتی ہے اور استعجاب خود ایک فعلیت دماغی کا نام ہے۔ کیوں کہ اس صورت میں دماغ کے ان مرکزوں تک اثر پہنچتا ہے جو ایک مدت سے بیکار پڑے تھے۔

تشبیہات قریب و متبذل میں نہ استعمال قوت کا موقع ملتا ہے نہ وہ باعث استعجاب ہیں۔ اس لیے ان میں کسی قسم کی لذت نہیں ہے ایسے مضامین کو سنانا سامعہ خراشی ہے اور سامعہ خراشی درحقیقت ایک امر مولم ہے۔ لہذا اس قسم کے شعر درحقیقت مولی اور موذی ہیں۔ اور ان کے سننے اور سنانے سے احتراز اولیٰ ہے۔

آپ نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہوگا کہ شعر میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہو۔ وہ مجہول الکنہ بات یہی ہے جس کی اصلیت کو ہم نے بیان کر دیا یعنی شعر میں ایسی کوئی بات ضرور ہو جس سے سامع کو قوت دماغی کے استعمال کے صرف کرنے کا موقع ملے۔ مگر اس کی بھی ایک حد خاص ہے یعنی صرف قوت کو اعتدال ضروری۔

بعض صاحب معنی بند شعر کہتے ہیں۔ ایسے لوگ دہلی میں بہت تھے جن کے ہر شعر کے سمجھنے کے لیے قوتِ فکر کو حد اعتدال سے زیادہ محنت کرنا ہوتی تھی۔ اس قسم کے اشعار بھی لذت اور تفریح کے لیے مفید نہیں ہیں۔ ایسے چند شعر سن کر طبیعت تھک جاتی ہے اور پھر اس طرف تادیر متوجہ نہیں ہوتی۔ دماغ کے پردے بہت ہی نازک ہیں، ان کی لذت کے لیے نازک نازک خیالیوں کی ضرورت ہے۔ نازک خیالی اور دقت مضمون دو امر جداگانہ ہیں۔ ایک کے دھوکے سے دوسرے کو اختیار کر لینا بڑی غلطی ہے۔

پہلے میں کہہ چکا ہوں کہ شاعری کی وسعت مثل قسمتِ عالم کے لامحدود ہے

اس سے میری یہ مراد ہے کہ مبادی مضامین جس کو مبادی تشبیہہ بھی کہتے ہیں لاتعداد ولاتحصی ہیں۔ ان میں سے بعض کا میں ذکر کرتا ہوں۔

آسمان۔ اس سے ہم کو سمت، وسعت، رفعت کے ایسے عالی مضامین مل سکتے ہیں مگر ان سب کے ساتھ ہی خوف کی اصل بھی اس میں شامل ہے۔ علم نجوم کے اعتقاد نے اس کے ساتھ ہمارے تعلقات کو بھی بہت وسیع کر دیا ہے عام اس سے کہ کسی کو نجوم پر اعتقاد ہو یا نہ ہو زبان مروجہ اس کے لوث سے بہ مشکل پاک ہو سکتی ہے۔ علم نجوم نے آسمان کے صفات اعلیٰ مثلاً فضا اور نظام اس کے تصورات کو بہت نقصان پہنچایا۔ اب ہمارے شعرا اس کو ظالم اور کج رفتار کے خطاب سے اکثر یاد کرتے ہیں۔ نظام بطلیموسی نے آسمان کو محدود کر دیا ہے اس لیے ہم کو اس کی فضائے لامتناہی کا تصور جس کا بہت ہی عمدہ اثر تخیل بلکہ اخلاق پر ہو سکتا ہے (حاصل نہیں ہوا)

مسائل ابتدائی علم ہیئت جس سے کہ اجمالی تصور عالم سماوی کا ذہن میں پیدا ہو جائے شاعر کے لیے منجملہ واجبات ہے۔ صرف نظام شمسی جس میں ایک آفتاب اور نو سیارے اور متعدد اقمار شامل ہیں۔ اگرچہ وہ اس قدر وسیع ہے کہ ہمارا وہم اس کے ادراک سے قاصر ہے پھر بھی کل عالم کی وسعت کے مقابلہ میں ایک ذرّہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اس کے ساتھ ہی مجھ کو یہ بھی کہہ دینا چاہیے کہ ہمارے معاصرین اکثر کتم متصل اور منفصل کے تصور اور تقابل سے بے بہرہ ہیں، اور اس صورت میں ممکن نہیں کہ عالم کی وسعت کا ایک اجمالی تصور بھی ان کے ذہن میں آسکے۔

عظمت مضامین شعریہ میں سے اصل اول ہے، جب اس کے تصور سے شاعر بے بہرہ رہے گا تو اس کے ذہن پر اصل کا اثر ہی نہ ہوگا۔ اور نہ اشعار میں اس کے ان کا پرتو پایا جائے گا۔ ہم فضائے اثیری اور ان بے شمار اجسام سے جو اس میں ایک وضع خاص و رفتار خاص کے ساتھ حرکت کرتے رہتے ہیں بالکل

واقف نہیں نہ ہم کو اجرام سماوی کا وزن اور حجم اور رنگ اور ان کے تغیرات میقات پر اطلاع ہے۔ نہ ہم اس نظام موسیقی سماوی کو سمجھ سکتے ہیں جس کا فیثاغورث نے تقریباً دو ہزار چھ سو برس پیشتر ذکر کیا تھا۔

علم موسیقی نظری سے ہم بالکل بے بہرہ ہیں۔ علم تالیف اور ایقاع کو جانتے ہی نہیں۔ چند وزن متعارف کو جن پر اردو شاعروں نے خامہ فرسائی کی ہے انھیں موزونی طبع کا جولان گاہ سمجھے ہوئے ہیں مثلاً ہم کو یہ نہیں معلوم کہ کون سا شعری وزن کس قسم کے بیان کے لیے مناسب ہے۔ شاعری ہماری، دو مصرعوں پر موقوف ہے۔ اگر ان میں مناسبات معمولی ہوئے اور بعض وہ صنعتیں جو دائم الوقت ہیں شعر میں پائی گئی تو گویا ہم نے شاعری کا حق ادا کر دیا۔ جس طرح ہمارے مضمون مصنوعی یعنی غیر طبعی ہیں اسی طرح ہماری طبیعت بھی اس کی معتاد ہو گئی ہے۔ ہمارا مذاق شعر بالکل صحیح نہیں ہے۔ نہ ہم فطرت کی عظمت جمال اور لطافت سے متاثر ہو سکتے ہیں اور نہ اس کے انعکاس ذریعہ ہمارے اشعار کے ہمارے سامعین یا ناظرین پر پڑ سکتا ہے ہم نے اصلی باغ کو نہیں دیکھا، کاغذ کے کترے ہوئے پھول آرائش کے تختوں پر دیکھ لیے ہیں اس کو تختہ گلزار سمجھے ہوئے ہیں۔ ہم نے ریل کا انجن کبھی نہیں دیکھا مگر اپنے قیاس سے (جس کی وسعت معلوم) اس کا نقشہ کھینچنے کے لیے آمادہ ہیں۔ بغیر علم ہیئت کے مبادی کو سمجھے ہوئے ہم کم از کم ایک ثلث اپنی شاعری کا نذر غفلت کر دیتے ہیں۔ باقی رہے دو ثلث ان کا حال آئندہ معلوم ہوگا۔

اس مقام پر ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اگلے شاعروں میں سے بھی اکثر ان علوم سے بے بہرہ تھے جن کا ذکر اب تک کیا گیا یا آئندہ کیا جائے لیکن ان کے اشعار مقبول ہیں۔ اگر اگلے شاعروں سے عرب کے زمانۂ جاہلیت کے شاعر یا اور اسی طبقہ کے شعراء جو اور ملکوں اور قوموں میں سرآمد روزگار ہو گئے ہیں مراد ہیں تو ہم کہیں گے کہ ان کی شاعری ہرگز کتابی نہ تھی، ان کے اذہان

علوم کتابی سے خالی تھے مگر ان کا دل فطرت کا آئینہ تھا، ان کی توجہ صوت وحرف میں مقید نہ تھی۔ وہ حقیقتوں کا معائنہ اپنی آنکھوں سے کرکے اپنی زبان سے اس کو ادا کر دیتے تھے۔

متاخرین یورپ اس بھید کو سمجھے ہوئے تھے۔ ان کے شعراء نے اپنی طبیعت کو اس آزادی کے ڈھرے پر ڈال دیا۔ جو شاعر کے لیے موزوں ہے۔ وہاں کا ہر ایک شاعر عجائبات دنیا کی سیر خوش نما جھیلوں اور جزیروں، گھاٹیوں اور آبشاروں کو دور دراز سفر کرکے ملاحظہ کرنا۔ تاریخی مقامات پر جانا منجملہ واجبات سمجھتے ہیں لہذا ان کے اشعار سے ناظرین کو سیر بین کا لطف آتا ہے۔

والٹر اسکاٹ ایک رزم گو شاعر اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا تھا۔ اس کے وطن کے پہاڑ سبزہ زاروں سے آراستہ نہ تھے۔ اس نے عالم طفولیت وشباب میں انھیں پہاڑوں کی ایک ایک گھاٹی کو نہایت شوق سے دیکھا تھا۔ اس کو اس قسم کے سنگستان سے ایک اُنس سا تھا۔ ان پہاڑوں کی سیر کرنے والے پر ظاہر ہے کہ سوائے ہول اور وحشت کے اور کیا اثر ہو سکتا ہے ہول اور وحشت کے مقابلہ کے لیے انسان میں ایک قوت ہے جس کو قوت غضبی کہتے ہیں۔ اسی قوت کی تہذیب کا نام علم الاخلاق میں شجاعت رکھا گیا ہے۔

لہٰذا ایسا شخص جس کے نفس پر ہول اور دہشت کا تصور ہوتا رہتا ہے اور وہ عالم خیال میں بہ سبب اپنی ذاتی شجاعت یا بہ سبب اس جوش کے جو شجاعان ملک کے تاریخی واقعات پر نظر کرنے اور ان مقامات کے دیکھنے سے جہاں معارک جدال وقتال واقع ہوئے ہوں پیدا ہو جاتا ہے۔ مقابلہ کرتا رہتا ہے۔ اگر وہ شاعر ہوگا تو ضرور رزمیہ اشعار خوب کہے گا اور یہی حال اسکاٹ کا ہوا۔

فردوسی کے واقعات پر نظر کرنے سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

بد دشعور سے اس کو دہقان پیر کی زبانی اگلی سپاہ گری کے معرکوں کی کہانی سننے میں لطف آتا تھا۔ اس کی طبیعت میں انتہا کی جواں مردی تھی۔ اور جن ملکوں میں اس کو سفر کرنا پڑا وہ نہایت ہی دشوار گزار اور ہولناک تھے۔ یہی اسباب جمع ہو کے شاہ نامہ کی تصنیف کا باعث ہوئے۔ سعدی کی حیات سے ظاہر ہے کہ اس کو سن شباب میں ترک وطن کر کے بغداد آنا پڑا اور یہیں وہ طالب العلمی کر کے فاضل مستند کے درجہ پر فائز ہوا۔ پھر اس کو متعدد سفر کرنا پڑے، اور دنیا کے نشیب و فراز دیکھے۔ بہت بڑا تاریخی انقلاب جو اس کے زمانے میں ہوا وہ سلطنت عباسیہ کا زوال اور سلطنت مغلیہ کا عروج تھا۔

یہی سب امور اس کے رنگ طبیعت کے موجب ہوئے۔ اس کے اشعار سے انتہا کی تجربہ کاری پائی جاتی ہے۔ ظرافت و شاعرانہ کمال اس کا ذاتی ہے جس نے اس کے اشعار کو نہایت ہی با مزا کر دیا۔

خلاصہ تقریر یہ ہے کہ ذاتی تجربہ کو اس فن میں بہت کچھ دخل ہے۔ تجربہ کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ اتفاقات ایسے ہوں کہ اکثر اشیاء کا مشاہدہ ہو جائے مثلاً دور دراز کا سفر خانگی حالات، ملاقات احباب یا اور اسی قسم کے جو اسباب عملاً یا بذریعہ علم کے قصداً تجربہ کیے جائیں جیسا کہ علوم عقلیہ تجاربیہ کا معمول ہے اصطلاحاً جو امور بلا قصد پیش آتے ہیں ان کو مشاہدہ اور جو بالقصد کیے جاتے ہیں ان کو تجربہ کرتے ہیں۔ میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ ہمارے اکثر معاصرین تجربہ قسم متصل و منفصل سے بے بہرہ ہیں۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ ذہناً اعداد اور ابعاد کا توہم نہیں کر سکتے اگرچہ اس کا علم بھی ہو۔ مثلاً زمین کا قطر تقریباً آٹھ ہزار میل ہے اور محیط پچیس ہزار میل۔ یہ اکثر صاحبوں کو معلوم ہو گا۔ مگر پچیس ہزار میل زبان سے کہہ دینا یا بذریعہ رقوم و اعداد کے کاغذ پر لکھ لینا کافی ہے۔ اس پچیس ہزار میل کا توہم حقیقی

اس کو ہو سکتا ہے جس نے کل زمین کا دورہ کیا یا یہ کہ اور ذرائع سے اس کا تصور حاصل کیا ہے۔

ایک یہ کہ اگر ریل گاڑی تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلے اور کسی جگہ نہ ٹھہرے تو آٹھ سو تینتیس گھنٹہ بیس منٹ میں زمین کا دورہ پورا ہو جائے گا جس کے چونتیس یوم سترہ ساعت بیس منٹ ہوتے ہیں۔ اگر اس مدت تک ریل گاڑی پر بیٹھے رہیں تو کس قدر کسل ہوگا۔ یا مثلاً پا پیادہ زمین کے گرد سفر کریں (بشرط امکان) اور بیس میل فی یوم چلیں تو بارہ سو پچاس دن یعنی قمری چھ ماہ گیارہ یوم میں دورہ کامل ہو جائے گا (تین مہینہ ۳۰۔ اور تین مہینہ ۲۹ یوم کے)

اجرام سماوی میں سے آفتاب کا اثر تخئیل پر سب سے زیادہ ہے، اور یہی سبب ہے کہ مذہب کی تاریخ کے ملاحظہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب پرستی بہت ہی قدیم مذہب ہے۔ اکثر زبانوں میں جہات اربعہ کے نام سے وضع سایہ شمس کی پائی جاتی ہے۔ مثلاً لفظ شمال کے معنی بائیں ہاتھ کے ہیں۔ اگر کوئی مشرق کی طرف منھ کر کے کھڑا ہو تو ضرور شمال اس کے بائیں ہاتھ کی طرف پڑے گا۔ آفتاب کی حرارت سے قوت قہری اور اشراق اور تنور سے نور اور تنور اور حرارت کی آمیزش سے جلال کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے ملکوں میں گرمی زیادہ ہے۔ اس لیے اس کا تصور الم سے خالی نہیں۔

سرد ملکوں کے رہنے والوں کا خیال نسبت آفتاب جداگانہ ہے۔ ان کے نزدیک اس میں شان محبوبیت پائی جاتی ہے۔ اور اس کا انھیں وجد ان ہوتا ہے۔ ہمارے ملکوں میں بھی ظہور نیر اعظم کے وہ واقعات جن میں حرارت اعتدال کے ساتھ ہے نہایت ہی پسندیدہ منظر دکھاتے ہیں۔ شفق، سفیدۂ سحری اور طلوع آفتاب سے ہزارہا مضامین اخذ کیے گئے ہیں چوں کہ آفتاب کا جرم مرئی چھوٹا سا معلوم ہوتا ہے اور عام نگاہیں اس کی عظمت کی حد تک

نہیں پہنچ سکتیں ۔۔۔۔۔۔ ایک اجمالی تصور اس امر کا کہ آفتاب زمین سے بڑا ہے شاید عام لوگوں کو بھی ہو مگر وہ کافی نہیں ہے ۔ اس امر کا تصور دلوں میں بہ مشکل پیدا ہو سکتا ہے کہ آفتاب اور زمین کے قطروں میں (۷۹۱۲) امیال اور (۸۸۷۰۷۶) امیال کی نسبت ہے یا یہ کہ آفتاب زمین سے (۹۵۲۹۸۲۶۰) امیال کی دوری پر ہے، اور یہ امور تو اس سے بھی زیادہ بعید الفہم ہے کہ اس قدر بعد سے آفتاب زمین کو کھینچتا ہے ۔

ماہتاب آفتاب سے استفادۂ حرارت و نور کرتا ہے کسب حرارت کی مثال آتشی شیشہ سے بہتر نہ ہوگی جو اس قدر بعد سے اتنی حرارت جذب کر لیتا ہے کہ آگ لگا دینے کے لیے کافی ہے ۔ سوائے ماہتاب کے اور سیارے بھی کسب نور کرتے ہیں اور بہ لحاظ قرب و بعد اور مسافت اور عدم مسافت کے کمی اور زیادتی نور کی مثل قمر کے ان سیاروں میں بھی ہوتی رہتی ہے ۔

اجرام سماوی کے اوقات ظہور و خفا اور حرکات مستقیم و رجعت وغیرہ سے شعرا نے بہت کام لیے ہیں ۔ اشکال سماوی جن کا تعین اور تسمیہ محض وہمی تھا شاعری میں مدتوں سے جاری ہے ۔ ہمارے شعرا کے خیالی آسمان میں اشکال و بروج وغیرہ زندہ موجود رہتے ہیں ۔ اور ان کی طرف صفات ذی حیات جانوروں کے منسوب کیے جاتے ہیں، مگر اب اس میں کوئی اثر باقی نہیں رہا ۔ اس لیے کہ اثر موہوم واقعیت سے بہت بعید ہو گیا ہے، اور اب جس قدر اثر باقی ہے وہ بہ سبب عدم علم کے ہے ۔ ورنہ درحقیقت اس میں کوئی لطف نہیں ہے ۔

یہاں پر ایک نکتہ باریک عرض کرنا ہے کہ ہر تشبیہ کی وسعت وجہ شبہ تک محدود ہے اس سے زیادہ توسیع لغو محض ہے ۔ مثال اس کی یہ ہے کہ معشوقوں کے خط کو سبزہ سے تشبیہ دیتے ہیں ۔ اب اس سبزہ کے لیے کوئی جانور چرندہ قرار دینا یا اس سبزہ کا خشک ہو جانا یا اس سبزہ کا سوکھی گھاس بن کے بھاڑ میں جھونکا جانا یہ مضامین وجہ شبہ کی حد سے خارج

ہیں فلہذا لغو ہیں۔

تشبیہوں کو اپنی حد پر رکھنا فطرتِ سلیم کا کام ہے ورنہ متقدمین اور متاخرین اکثر کے کلام میں یہ نقص پایا جاتا ہے غالباً اس قانون کی طرف توجہ نہ تھی۔

میں سابقاً عرض کر چکا ہوں کہ ہمارا آسمان ذہنی ہے۔ ہم کو عالم خارجی کے مشاہدے کا شوق ہی نہیں اس وجہ سے ہم کو ثوابت اور سیارات، ذوات الاذناب، شہاب، بروج و اشکال۔ کہکشاں۔ خسوف و کسوف۔ زمین، فضا، اہویہ، بخارات طوفان۔ گرد و باد۔ سحاب۔ رعد و برق۔ باران وغیرہ سے نئی نئی تشبیہیں نہیں مل سکی ہیں۔ ورنہ یہ مبادی تشبیہہ ہمارے اور نیز ہمارے بعد مدت ہائے مدید تک بلکہ تا قیامت زبردستوں کے واسطے کفایت کرتے۔ مبدہِ فیاض کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوتا۔ مگر لینے کے واسطے تمیز چاہیے۔

زمین جس پر ہم آپ رہتے سہتے ہیں یہی کیا کم ہے۔ کوہستان، وادی، غار میدان، جنگل، سمندر، دریا، چشمہ سار۔ آبشار، ترائی، سراب وغیرہ سب خدا کی قدرت کے نمونے ہیں۔ ان کے علاوہ زمین پر جو چیزیں پائی جاتی ہیں از قسم جمادات و نباتات و حیوانات۔ جمادات میں سے طرح طرح کے خوش رنگ پتھر۔ الماس، یاقوت، زمرد، پکھراج، نیلم وغیرہ۔ نباتات میں سے ہر قسم کے درخت، ان کے رنگا رنگ پھول یا بیج و شاخ و برگ، غنچہ، ثمر، نمو، رس، یا حیاتِ انسانی میں سے صحت و مرض۔ استخواں۔ رطوبات۔ عضلات۔ دل۔ جگر۔ ریح۔ معدہ۔ طحال۔ سر۔ رخ۔ دماغ۔ زبان۔ دست و بازو۔ ہاتھ پاؤں۔ پھر ان کے اجزا اور لوازم میں طرح طرح کی منفعتیں اور خوبیاں ہیں جن کی تصویریں شاعروں کو ہو بہو دکھانا چاہیے۔

حیوانات مخصوصہ مثل شیر و پلنگ۔ روباہ۔ خرس۔ گوسفند۔ گاؤ۔ اور دوسرے وحش و طیر و ہوا وغیرہ غرض کہ یہ سب شعرا کے واسطے ہیں۔ مخلوقات الٰہی کے ماورا انسانی مصنوعات سے شعرا نے بہت مضامین

اخذ کیے ہیں مثلاً جہاز و قصر و منار وغیرہ۔

حال کے مصنوعات مثل ریلوے انجن و تار برقی وغیرہ کو ابھی ہمارے ملک کے شاعروں نے علیحدہ رکھا ہے اس کی وجہ معلوم نہیں۔

فطرت کے ذخائر سے ابھی بہت ہی کم چیزیں ایسی ہیں جن سے ہمارے شعرا نے کام لیا ہے۔ مثلاً اقسام طیور ہی کو لیجیے۔ اہل علوم نے تین ہزار سے زیادہ انواع طیور کا بیان کیا ہے۔ ہمارے شعرا کو ان میں سے بلبل۔ کبک۔ طاؤس۔ طوطی۔ قمری۔ زاغ۔ ہما۔ عنقا۔ موسیقار۔ بس انھیں چند جانوروں کا نام یاد ہے۔ ان میں سے موسیقار۔ ہُما اور عنقا محض خیالی ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس درختوں میں بھی یہی کیفیت ہے۔

اب علوم کی طرف آئیے۔ الٰہیات۔ ریاضیات۔ طبیعیات۔ علم تمدن۔ تدبیر منزل علم اخلاق۔ ان علوم کے مسئلوں کو شعرا اس خوب صورتی سے بیان کر سکتے ہیں کہ سامع ہر چند کم فہم ہو مگر وہ اسے سمجھ سکتا ہے اگرچہ مبادی تشبیہ کو جس تفصیل کے ساتھ میں بیان کرنا چاہتا تھا وہ اس بے اطمینانی اور تشویش کے زمانہ میں مجھ سے نہ ہو سکا مگر پھر بھی آپ اگر ایک نظر ان امور کی طرف کریں گے جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اور پھر اپنے ملک کی شاعری کو ملاحظہ کریں گے تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ ہماری شاعری کس درجہ محدود ہے۔ اور ملکوں کے شاعر دور دراز ملکوں میں جا کر آثار فطرت اور مصنوعات انسانی کا ملاحظہ کرتے ہیں۔ مثلاً یورپ کے شاعر اطالیہ خصوصاً رومۃ الکبریٰ میں جا کر قدیم رومیوں کی عمارت تمدن معابد و ہیاکل کو دیکھنا لازم اور ملک سوئٹزرلینڈ کی جھیلوں کا تماشا واجب سمجھتے ہیں۔

ہمارے وطن لکھنؤ کے شاعروں میں سے اکثر کالے پہاڑوں تک نہ گئے ہوں گے جو ناف شہر سے دو تین میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ آپ خوب جانتے ہیں کہ ہر چہ از نگہ خیزد بر دل ریزد۔ خود شاعر کے دل پر جس چیز کا اثر پڑتا ہے

جب اُسے وہ بیان کرتا ہے تو اور لوگ بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ ایک ظاہری وجہ تو اس کی یہ ہے کہ جس امر کا تجربہ خود انسان کو نہیں ہوتا اسے وہ بیان ہی نہیں کر سکتا۔

مخلوقات اور مصنوعات عالم خارجی کے سوا عالم ذہنی سے بھی بہت سے مضامین شعرا کو مل سکتے ہیں۔ یعنی ان چیزوں سے جن کو ہم نے بذریعہ کسی حس کے دریافت نہیں کیا ہے بلکہ ان کا وجود بالفعل ذہنی ہے۔ مثلاً بہشت، دوزخ، قیامت میزان، صراط وغیرہ اس قسم کے مضامین مذہبی تخیلات کے واسطے بہت ہی مفید ہیں۔ علم تاریخ سے شعرا کو بہت مضمون مل سکتے ہیں نامی گرامی شعرا کے کلام میں تلمیحات تاریخی ہوا کرتے ہیں۔ تلمیح کا رواج ہمارے شعرا میں کم ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ واقعات تاریخی نہ عام شعرا کو یاد ہیں نہ عام سامعین و ناظرین ان کو سمجھ سکتے ہیں لیکن اس قسم کی تلمیحات کو فروگزاشت کرنے کی کوئی وجہ کافی موجود نہیں بلکہ اگر اس کی مراعات لی جائے تو میدان شعر وسیع ہو سکتا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ فائدہ بھی ہے کہ وہ واقعات جن کو شاعر نظم کر دیں گے وہ ضرور ہی مشہور ہو جائیں گے۔

ہمارے شہر بلکہ ہندستان کے لیے باعث فخر دو شاعر مرزا دبیر اور میر انیس اعلی اللہ مقامہما نے احادیث و روایات کو نظم کرنے کا التزام کیا اور اس قسم کے تلمیحات اپنے کلام میں داخل کیے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ ان کے کلام بلاغت نظام کو دیکھنے کا شوق رکھتے ہیں ان کو ہزارہا واقعات تاریخی سیرت انبیاء اور ائمہ ہدیٰ پر اطلاع ہو گئی۔ اخلاق پر اس سے بہت ہی عمدہ اثر پڑا۔ جیسی ان دو شاعروں کو تعظیم و توقیر ہوئی اور شعرا کو نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ جس قدر زمانہ گزرتا جائے گا ان کا کلام مطبوع ہوتا جائے گا۔ اس سے زیادہ ان کا کلام قدر و منزلت کے لائق تھا۔ مگر افسوس کہ ان کی شاعری کا تعلق فرق اسلام میں سے صرف ایک فرقہ کے

ساتھ تھا۔ اگر اس مذہبی خصوصیت سے قطع نظر کر کے دیکھیے تو بھی یہ شاعری قابل قدر ہے۔

یہ خصوصیت تو باعتبار مضامین کے تھی، ایک خصوصیت باعتبار صورت ظاہری کے بھی ہے۔ وہ یہ کہ جزو اعظم ان کے مرثیوں کا صرف ایک صنف ترکیب مسدس کے ساتھ مختص ہے۔ ممکن تھا کہ ہر صنف شعر میں مرثیے کہے جاتے۔ یا سوائے ان مضامین کے جو مرثیہ کے ساتھ مختص کر دیے گئے ہیں عام مضامین حکمت و اخلاق کے کہے جاتے۔

اس موقع پر مجھے یہ کہنا پڑا کہ ہمارے شعرا نے نہ صرف از روئے معنویت بلکہ لفظاً بلکہ وزناً بھی اپنے کلام کو محدود کر دیا۔ (بحور) اور اوزان جو اردو شاعری میں رائج ہیں وہ بھی بہ نسبت فارسی اور عربی کے کم ہیں۔

بعض صاحب یہ کہیں گے صرف وہی وزن از روے طبیعت پسندیدہ ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ اوزان بحور مزاولت سے مطبوع اور پسندیدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ بعض اوزان جن کو میں خود غیر مطبوع تصور کرتا تھا مزاولت سے مطبوع ہو گئے اور مزاولت کے واسطے زیادہ محنت کی ضرورت نہیں ہے جو وزن اچھا نہ معلوم ہوتا ہو اس میں چند شعر کسی شاعر کے کہے ہوئے یا اپنے آپ ہی چند شعر موزوں کر کے دس بارہ منٹ تک زبان سے پڑھے جائیں یا کم از کم الفاظ و وزن کو زبان پر جاری کریں اور اگر مع ترنم ہو تو جلد تر اثر ہو گا۔ اوزانِ شعر میں اور تصرفات جائز بھی ہو سکتے ہیں بلکہ بعض تغیرات کیے بھی گئے ہیں اور وہ علی العموم پسندیدہ ہوئے۔

ایک اور امر بھی لائق غور ہے کہ ہمارے شعر کہنے کا کیا اصول ہے۔ آج کل عموماً غزل گو شاعر زیادہ ہیں، کہیں مصرع طرح کا دے دیا گیا یا خود کسی استاد کے دیوان کی کوئی طرح پسند کی یا خود ہی اپنی طبیعت سے کوئی

نئی زمین نکالی، اب قافیوں پر نظر کی اور ہر ایک قافیہ کا لگاؤ ردیف کے ساتھ دیکھنا شروع کیا۔ اسی اثنا میں ہر قافیہ کے ساتھ مصرع کہنے لگے، اب ان مصرعوں پر مصرع لگا دے، چلیے غزل ہو گئی۔ مطلع کہنا ذرا دقت طلب ہے اس لیے کہ اس میں دو قافیوں کا باہمی ربط اور پھر ردیف کے ساتھ دونوں کا علاقہ دیکھنا پڑتا ہے۔ بہر صورت مضامین قافیوں سے پیدا کیے جاتے ہیں غزل اور غزل کے مثل جو اصناف شعر ہیں مثلاً قصیدہ اور ترکیب بند اور ترجیع بند سب کی ترکیب کا اصل اصول یہی ہے۔

مرثیہ میں بند کا پہلا یا چوتھا یا چھٹا مصرع پہلے کہہ لیتے ہیں، اور پانچ مصرعے اور لگانا پڑتے ہیں۔ غزل میں مضمون کو سمیٹنا پڑتا ہے اور مسدس میں پھیلانا پڑتا ہے۔ رباعی میں بھی صرف ایک مصرعہ کہہ کے تین مصرعے اور قوافی کی پابندی سے پیدا کیے جاتے ہیں۔

ان سب اصناف میں شاعر کی طبیعت کو قافیوں کی متابعت کرنی پڑتی ہے۔ مثنوی میں البتہ شاعر کسی قدر آزاد ہوتا ہے۔ ہر ایک مصرعہ اپنی طبیعت سے مضامین کی مناسبت کے ساتھ پیدا کرتا ہے اور دوسرا مصرعہ اس مصرعہ کے کسی قافیہ کی پابندی سے کہنا ہوتا ہے۔ اس لیے اکثر مثنوی کہنے والے دوسرے مصرعے برائے بیت لگا دیا کرتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مصرعہ کہا اور دوسرا مضمون جو اس سے دست و گریبان ہے اس مصرعہ کے قافیہ کے ساتھ نہیں آتا اس صورت میں سخت افسوس ہوتا ہے۔ نواب مرزا شوق مرحوم کا وہ شعر ؎

عشق کیا چیز ہے بلا جانے
ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

دونوں مصرعوں میں کیسی مناسبت ہے، گویا دوسرا مصرعہ اسی کے لیے تھا مگر قافیہ نہ ملا۔ اسی مشکل پر نظر کر کے متقدمین یونان اور متاخرین

انگلستان نے قافیہ کی قید کو اڑا دیا، نظم بے قافیہ کہنی شروع کی۔ اس قسم کی نظم کو ہمارے برِ اعظم میں نثر مرجز کہتے ہیں۔

جب پہلے پہل انگلستان میں نظم بے قافیہ میں لوگوں نے شعر کہے، ڈاکٹر جانسن سے جو اُس وقت کے محققین لغت سے تھا لوگوں نے رائے طلب کی۔ جانسن نے کہا کہ پھر اس سے نثر ہی کیوں نہیں کہتے اگر ہمارے ملک میں کوئی اس طرح کی نظم کہے (بلکہ بعض نے کچھ کہا بھی) تو اس کی نسبت یہی کہا جائے گا راقم الحروف نے خود کئی مرتبہ کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ واقعی کچھ بے تکی سی معلوم ہوتی ہے۔

سوائے نظم مرجز کے ایک صنف نظم کی ایسی بھی ہے جس کو موزوں بغیر قافیہ کہہ سکتے ہیں یعنی فرد اس لیے کہ فرد میں بھی قافیہ کی قید نہیں ہے۔ بلکہ بعض محققین کے نزدیک عدم قافیہ فرد میں مشروط ہے اور جو دو مصرعہ مقفیٰ ہوں انھیں مطلع کہتے ہیں۔ اگرچہ راقم الحروف کے نزدیک فرد میں عدم تقفیہ واجب نہیں ہے، کیوں کہ مطلع ایک جزو غزل یا قصیدے کا ہے کوئی مستقل صنف شعر نہیں ہے۔ بہر نوع ایک مجموع فردیات کو نظم بے قافیہ سمجھ لیجیے۔

اس صورت میں ایک خاص تصرف کرنا پڑے گا۔ وہ یہ کہ فرد میں ایک مضمون ایک ہی بیت میں ختم ہو جاتا ہے اور مجموعہ فردیات میں ایک فرد کے مضمون کو دوسری فردوں سے تعلق رہے گا۔ ہمارے ملک میں بھی شاعری کا میلان اسی طرف ہے کہ نظم سے قافیہ کی قید حتی الوسع کم کر دی جائے تاکہ شاعر کو خیالات کو آزادی سے موزوں کرنے کا موقع ملے۔ اور یہ میلان اس وقت سے شروع ہوا ہے جب سے سنگلاخ زمینوں میں غزل کہنا ترک کیا گیا۔

ذوق کے استاد نصیر کا دیوان دیکھیے سرے سے آخر تک سنگلاخ

زمینیں بھری پڑی ہیں۔ اگرچہ اس سے شاعر کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے مگر کوہ کندن اور کاہ برآوردن کا مضمون ہے۔ خیالات اور جذبات کا لطف نہیں ملتا۔ ہمارے زمانے کے شعرا جن کا کلام مطبوع خاص و عام ہے۔ مثلاً نواب مرزا صاحب، داغ دہلوی یا جناب امیر احمد صاحب امیر مینائی یا حکیم ضامن علی صاحب جلال لکھنوی یا اور اساتذہ حال ان بزرگوں کے کلام میرے دیکھنے سننے میں آئے ہیں۔ میں نے سنگلاخ زمینیں نہیں دیکھیں۔ بخلاف اس کے اگلے شعرا میں اس قسم کی زمینیں کم و بیش سب کے کلام میں پائی جائیں گی۔ اگلے شاعروں میں میر تقی میر بھی سہل اور شگفتہ زمینوں[1] میں شعر کہتے تھے۔

ایک تصرف اور راقم الحروف نے تجویز کیا ہے اگر اس طرز پر کچھ نظمیں کہی جائیں تو عجب کیا کہ مطبوع ہوں، وہ یہ ہے کہ ایک مصرعہ پر دو دو مصرعہ تین تین مصرعے یا زیادہ لگائے جائیں۔ اور اس قسم کے ہر ایک قطعہ کو ان میں سے ایک دور کہیں اور کم سے کم دو دوروں کے اخیر مصرعے مقفیٰ ہوں یہ کچھ ضرور نہیں کہ ہر دور میں تعداد مصرعوں کی مساوی ہو بلکہ کم و زیادہ ہو تو کچھ ہرج نہیں ہے، اور اس قسم کے بہت سے ادوار کا مجموعہ ایک نظم سمجھی جائے۔

مقصود ان تصرفات سے یہ ہے کہ شاعر کو اپنے خیالات آزادی سے نظم کرنے کی قوت حاصل ہو جب تک ایسا نہ ہوگا شاعری محدود رہے گی پھر قافیہ کی قید بالکل ترک کر دینا یہ بھی پسندیدہ نہیں ہے۔ پس کوئی نہ کوئی بات ایسی ہونا چاہیے جس سے دونوں باقی ہیں۔ یعنی آزادی مضمون اور قافیہ۔

میں نے مکرر کہا ہے کہ شاعری اور مصوری دونوں ایک ہی طرح کی

---

[1] شگفتہ زمین سے یہ مطلب ہے کہ اکثر قوافی غزل کے ردیف کے ساتھ مرتبط ہوں۔

صنعتیں ہیں، یہ قول حکیم ارسطاطالیس کا ہے۔ اچھا اب یہ تصور کیجیے کہ مصور جب کسی شے کی تصویر بناتا ہے وہ کیا کرتا ہے۔

۱۔ ایک صورت عمل کی یہ ہے کہ اس شے کو نظر کے سامنے رکھ کے اس کے اجزا کے تناسبات کے مطابق ہر تصویر کھینچتا ہے۔

۲۔ دوسری صورت عمل کی یہ ہے کہ (جب کہ شے جس کی تصویر کھینچنا منظور ہے موجود نہ ہو) متخیلہ میں جو اس شے کی تصویر موجود ہے سطح تصویر پر اس کی نقل کرتا ہے۔

۳۔ تیسری صورت عمل کی یہ ہے کہ (جبکہ ایسی شے کی تصویر بنانا ہو جو نہ خارج میں موجود ہو نہ ذہن میں) متخیلہ سے بعض اجزا کو بعض کے ساتھ ترکیب دے کے ایک جدید صورت اختراع کرتا ہے مثلاً ایسا شخص جس کے دس سر اور سو ہاتھ اور ہزار پاؤں ہوں۔

یہی تین صورتیں صنف شعر کی بھی ہیں۔

(۱) شے موجود فی الخارج حاضر ہو۔

(۲) شے موجود فی الخارج حاضر نہ ہو بلکہ ذہن میں اس کی تصویر ہو۔

(۳) شے نہ خارج میں موجود ہو نہ ذہن میں بلکہ ایک جدید صورت اختراع کی جائے۔

ہمارے شعرا کا معمول یا طریقہ ان میں سے کسی میں داخل نہیں ہے۔ ہم قافیہ میں سے مضمون پیدا کرتے ہیں ؎

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو می روی بہ ترکستان ست

نہ ہم خارج سے مضامین اخذ کرتے ہیں نہ ذہن سے، ہم کو اس پر قدرت ہی نہیں کہ کسی منظر کو دیکھ کے زبان قلم سے اس کی تصویر کھینچ سکیں۔

نظم ایک طرف، نثر میں بھی جہاں تک میں نے خیال کیا ہے یہی نقص پایا

جاتا ہے۔ اکثر ناول جو اس زمانہ میں لکھے گئے ان سب میں ایک ہی طرح کے منظر ہوتے ہیں، اور وہی ہر پھر کے آتے ہیں۔ جیسے اس شہر میں ایک غریب تھیٹر تھا جسے لوگ مذاق سے چیتھڑا کمپنی کہتے تھے، اس میں چند پردے تھے خواہ مخواہ تماشہ میں وہی پردے بار بار دکھائے جاتے تھے خواہ ان کا محل ہو یا نہ ہو۔

اکثر تقلید پیشہ ناول نویسوں نے رینالڈ کے ناول انگریزی میں پڑھے ہیں، اسی کے مضامین جس قدر یاد رہ گئے ہیں اس کو اپنے ناولوں میں صرف کرتے ہیں۔ قصہ میں بھی کوئی جدت نہیں ہوتی۔ میں نے کسی انگریزی کتاب میں انگلستان کے ناول نویسوں کے پلاٹ (قصہ) کی ایک عام صورت پڑھی تھی۔ اس کا ذکر اس موقع پر لطف سے خالی نہیں۔ واقعی ناولوں میں اس کے سوا ہوتا ہی کیا ہے۔

ایک باغ میں ایک خوب صورت نوجوان مس سے ایک صاحب بہادر کا سامنا ہوتا ہے۔ صاحب بہادر ایک جان سے ہزار جان عاشق ہو جاتے ہیں۔ مس صاحبہ سے اظہار تعشق کرتے ہیں اور شادی کا پیام دیتے ہیں۔ مس صاحبہ نیم راضی ہیں۔ صاحب بہادر مفلس ہیں اس لیے مس صاحبہ کے والد ماجد قطعی انکار کرتے ہیں۔

دلوں میں محبت رہتی ہے۔ مس صاحبہ کی شادی ایک اور صاحب سے ٹھہرتی ہے، یہ دوسرے صاحب بڑے دولت مند ہیں اس لیے مس صاحبہ کے والدین کو یہ شادی منظور ہے مگر بڈھے اور بدصورت ہیں، اس لیے مس صاحبہ کو منظور نہیں۔ پہلے صاحب سے پھر ایک باغ میں خفیہ ملاقات ہوتی ہے۔ پینگ بڑھتے ہیں، مس صاحبہ کے والدین مشتبہ ہو جاتے ہیں۔ پہلے صاحب بہادر مس صاحبہ کو بھگا لے جانے کا بندوبست کرتے ہیں، دونوں کی ایک رائے ہو جاتی ہے۔ صاحب ایک سیڑھی لے کر آدھی رات کو مس صاحبہ کے

بنگلے کی کھڑکی کے پاس سیڑھی لگا دیتے ہیں۔ مس صاحبہ اتر کر صاحب بہادر کے ساتھ ہو جاتی ہیں۔ کسی دور دراز ملک میں جا کر شادی ہو جاتی ہے۔ صاحب بہادر کے باپ مر جاتے ہیں۔ بہت سی دولت ہاتھ آتی ہے۔ مس صاحبہ کے والدین سے ملاپ ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ ہمارے ناول نویسوں کے لیے ایسا ہی ایک ڈھانچہ بنا دیا جائے۔ اسی پر ہزاروں ناول نام بدل بدل کر لکھ لیے جائیں۔

ایک اور خرابی ہمارے ملک کے ناولوں میں پردہ کے اصول کی وجہ سے ہے۔ کیوں کہ عوام عشق اور عاشقی کو ہر قصہ کی جان سمجھتے ہیں۔ لذّت فراق اور انتظار سب سے عمدہ مضمون خیال کیا جاتا ہے پھر اگر کسی پردہ نشین سے سامنا ہو بھی گیا تو بغیر اس کے کہ اس کی عصمت پر دھبّہ لگے۔ پیام سلام، وعدے وعید۔ فراق۔ انتظار یہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا اور جب تک یہ نہ ہو قصہ کا مزہ کیا۔ لہٰذا لازم ہوا کہ ہر ایک قصہ میں ناجائز محبتوں کا تذکرہ ہو اور یہ موجب خرابی اخلاق کا ہے۔

ناول پر کیا موقوف اور قصے بھی اسی طرح کے ہیں۔ نواب مرزا شوق کی مثنویوں میں زنا بالجبر کے ارتکاب کا مصنف نے خود اعتراف کیا ہے۔ آفتاب الدولہ قلق نے مثنوی طلسم الفت میں بین الاختین کو جائز رکھا ہے۔ قدیم مثنویوں میں میر حسن کی مثنوی بہت مقبول ہے اس میں بھی پہلے ناجائز طور سے وصال ہوا پھر فراق کے بعد شادی ہوئی۔ خلاصہ یہ ہے کہ گناہ گاروں کا ذکر قصہ کی جان سمجھی گئی ہے اس سے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے۔ ملکی قانون نے فحش الفاظ کے استعمال سے روک دیا ورنہ اور بھی فصاحتیں صرف کی جائیں اگلے قصوں میں ایسے مضامین بھی ضرور ہوتے تھے۔

کوئی قصہ اس سے پاک نہیں ہے اور اس سب کا سبب کلّی یہ ہے کہ فطرت کے ملاحظہ کا ہمارے ملک میں بہت ہی کم شوق ہے۔ جمال اور عظمت

کے تصورات سے اذہان قاصر ہیں، نئے مضمون کیوں کر نکالیں اور اگر نکالیں بھی تو ردیف اور قافیوں کی قیود کی وجہ سے موزوں نہ ہو سکیں گے۔ اور اگر کوئی موزوں کرے اور بعض تصرفات کو دخل دے تو نشانۂ تیر ملامت ہوگا۔ اعتبار کے دائرہ سے خارج ہو جائے گا۔ استادی میں بٹہ لگ جائے گا۔

اس سے پیشتر کسی مراسلہ میں ہم نے مبادی تشبیہہ کو بیان کیا ہے۔ اب ہم بعض اقسام تشبیہہ کو ایک جدید اصول سے بیان کرتے ہیں۔

باعتبار غرض کے تشبیہہ کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) وہ تشبیہہ جس سے مشبہ کی توضیح مقصود ہو۔

(۲) وہ تشبیہہ جس سے کوئی وجدان خاص پیدا کرنا مقصود ہو۔

پہلی غرض علمی ہے یعنی مفید ہے علم کے لیے، دوسری غرض وجدانی ہے جس سے قبض و بسط مطلوب ہو۔

مثلاً پوپ شاعر کے ایک شعر کا یہ مضمون ہے۔

"کہ انسان کی حیات کا جہاز عقل کی رسیوں اور خواہش کی ہوا کے زور سے چلتا ہے"۔

اس تشبیہہ میں یہ لطف ہے کہ جس طرح باد مخالف جہاز کی رسیوں کو توڑ کے جہاز کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ یہی حال ہماری خواہشوں کا ہے کہ جب وہ حد اعتدال سے متجاوز ہوتی ہیں تو گویا انسانی حیات کا جہاز طوفانی ہو جاتا ہے، اور انجام اس کا غرق ہے۔ یا سعدی کا وہ شعر مشہور ہے ؎

رعیت چو بیخ است و سلطاں درخت
درخت اے پسر باشد از بیخ سخت

صائب اور غنی کے اشعار اسی قسم کے ہیں، ان لوگوں نے اکثر ایسے ہی اشعار کہے ہیں ؎

بر تواضع ہائے دشمن تکیہ کردن ابلہی ست پائے بوس سیل از پا افگند دیوار را

اس آخری شعر میں سیل کو ذوی العقول میں سے فرض کر لیا گیا ہے مگر اس قسم کی تشبیہوں میں قوت کم ہوتی ہے اس لیے کہ بعض صورتوں میں عکس غلط ہو جاتا ہے۔ سعدی کا یہ شعر نہایت ہی عمدہ مثال ہے ؎

نہ محقق بود نہ دانش مند　　چار پائے بر و کتابے چند

بعض صورتوں میں مشبہ میں کچھ تصرف کر دیتے ہیں مثلاً پوپ شاعر نے علم و معرفت، کو شراب سے تشبیہہ دی ہے اور یہ کہتا ہے کہ ایسی ہے جس کے کم پینے سے نشہ ہوتا ہے اور زیادہ پینے سے دماغ صحیح ہو جاتا ہے۔ یہ خلاف واقع ہے مگر شراب کو لفظ معرفت یا حقیقت کے ساتھ بیان کر دینے سے (جیسا کہ شاعر نے کہا بھی ہے) وہ اعتراض مرتفع ہے۔

دوسری قسم وجدانی تشبیہوں کی غرض سے بالکل مغائر ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی مشبہ کا اثر وجدان پر کم پڑتا ہوا معلوم ہو تو اس اثر کو مشبہ بہ کے ذریعہ سے بڑھا دیں مثلاً ارسطا طالیس نے عدالت کو صبح کے ستارہ سے تشبیہہ دی ہے۔ واقعی عدالت ایک امر معقول ہے اس کا محض ذکر ایسا کوئی اثر نہیں پیدا کر سکتا ہے جیسا کہ صبح کے ستارے کی تخئیل سے پڑ سکتا ہے۔

وہ تشبیہیں جن کا اثر وجدان پر پڑتا ہے، اصل ان کی تصور الم یا لذات کا ہے۔ الم کا تصور لذت کے تصور سے زیادہ تر موثر ہے، اسی لیے حکمار نے اس افسانہ کو جس کا انجام غم پر ہوتا ہے زیادہ مفید خلائق بیان کیا ہے۔ بہ نسبت ان افسانوں کے جن کا انجام شادی پر ہے۔

وہ افسانے جس کا انجام غم پر ہے ٹریجڈی کہلاتے ہیں جس کو شیخ ابو علی سینا نے طراغودیا کہا (دیکھو کتاب شفا جملہ منطق۔ زیطور بطیقہ (خطابت) نوطنقیقیہ (شعر) وہ افسانے جن میں ذکر جنگ و جدال کا کیا جاتا ہے ایپک کہلاتے ہیں۔

علم نفس میں ثابت ہو چکا ہے کہ واقعی لذت اور الم سے جو اعصاب

متاثر ہوتے ہیں وہی اعصاب اس کے تخیّل سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اگرچہ واقعی تحریک تخیلی تحریک سے باعتبار قوت کے بہت ہی اخف ہوتی ہے۔ اس درجہ خفت کا تدارک اور طریقوں سے کیا جاتا ہے، تاکہ اثر تا حدّ امکان زیادہ ہو جائے۔

وجدانی اثر کے پیدا ہونے کے لیے یہ شرطیں ہیں اول مشبہ بہ اور مشبہ میں بہ حیثیت تاثیر کے مطابقت ہو اور مشبہ بہ اقوی ہو۔ دوم مبتذل نہ ہو۔ سوم ایک حد خاص سے متجاوز نہ ہو۔

پہلی شرط تشبیہہ کی ضرورت ذاتی سے ہوتی ہے۔ بالفرض اگر دو وجدان مغائر مشبہ بہ اور مشبہ سے پیدا ہوں تو ضرورت تشبیہہ کی فوت ہو جاتی ہے اگر مشبہ مشبہ بہ سے قوت میں زیادہ نہ ہو تو تخیلی اثر میں بہ نسبت واقعی کے جو کمی ہے اس کا تدارک نہ ہوگا۔ اگر مشبہ بہ اور مشبہ کی قوتوں میں نسبت مساوات کی ہو تو تشبیہہ عقلی ہو جائے گی۔ جس کی غرض محض بیان اور توجیہ ہے نہ تاثیر وجدانی۔ اور اس حالت میں بھی اعرافیت مشبہ بہ کی مشروط ہے اور اگر قوت میں کم ہو تو غرض تشبیہہ کلیتاً فوت ہو جائے گی۔

دوسری شرط مابہ الامتیاز ہے درمیان تشبیہہ عقلی اور وجدانی کے مبتذل سے مقصود وہی تشبیہہ ہے جس کی تکرار اکثر ہو چکی ہو۔

جس قدر تکرار زیادہ ہوتی جائے گی اعرافیت بڑھتی جائے گی پس غرابت اور اعرافیت میں نسبت عکسی ہے۔ غرابت مفید ہے وجدان کے لیے اور اعرافیت مضر ہے۔ برعکس اس کے اعرافیت مفید ہے توجیہ کے لیے نہ صرف غرابت بلکہ لازم اور ملزوم کا بعد بھی تشبیہہ وجدانی کے لیے مشروط ہے تاکہ تصادم ملائم کے لیے مفید ہو۔ تصادم ملائم اسی حالت میں پیدا ہوگا جب کہ لازم اور ملزوم میں بعد ہو اور ایک کے ذریعہ سے دوسرے کا علم بعد غور اور فکر کے حاصل ہو سکے۔ لراقمہ ؎

ادا کی شوخیوں سے اٹھتے اٹھتے جھک گئیں نظریں
مری قسمت سے ان کے تیر بھی آئے کماں ہو کر

اقتباسات

مرقع لیلیٰ مجنوں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

یا مصوّر[1] جلّ شانہ

ہے[2] مصوّر سے یہ ایما دیدۂ تصویر کا
کور ہے منکر تری رنگینیٔ تحریر کا

اے[3] بار الٰہ! زبان میں اثر دے، اپنے سائل کا منھ موتیوں سے بھر دے! سحر بیانی عطا کر، سیف زبانی عطا کر۔ اگلے سال ایک مثنوی سنا چکا ہوں "نوبہار"[4] کا سماں دکھا چکا ہوں۔ امسال کچھ اور ہی دھن سمائی ہے، ایک نئی بات دل میں آئی

---

[1] "مصوّر" اسمائے صفات باری تعالیٰ عز اسمہ سے ہے

[2] صنف کلام: مطلع غزل، بحر: رمل وافی محذوف۔ وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن دو بار۔ قصد شاعر: حمد میں تالیف مرقع کے تلازمے کو دخل دینا

[3] صنف کلام: نثر مقفّیٰ۔ قصد شاعر: مناجات بہ تلازمہ شعر مرقع

[4] "نوبہار" مرزا رسوا کی ایک مثنوی ہے جو اس کتابچے کی تصنیف سے ایک برس پہلے لکھی گئی۔ (عشرت)

ہے۔ جی چاہتا ہے کہ لیلیٰ مجنوں کے افسانے کو مرقع بناؤں، نجد کے کوچہ و بازار، دشت و کہسار کے نقشے کھینچوں، حسن و عشق کی خیالی تصویریں آنکھوں سے دکھاؤں۔ ناظرین کے دل سے آہ نکلے، زبان سے واہ نکلے۔

یہ سچ[1] ہے کہ اگلے رنگ اڑ لے گئے، ہر چیز کا مزا لے گئے مگر ہمیشہ بہار ہے، وہی گل ہے، وہی گلزار ہے۔ اس مے خانے میں کون کب محروم رہا ہے، جس مست کو دیکھو آج بھی جھوم رہا ہے۔

انسان کی طبیعت ہزار ہا برس میں نہیں بدلتی، جو بات روز اول سے کان میں پھونک دی گئی ہے، دل سے نہیں نکلتی۔ وہی کھانا ہے، وہی پینا ہے، وہی مرنا ہے، وہی جینا ہے۔ وہی عشق، وہی عاشقی، وہی لطف، وہی دل لگی۔ وہی آہِ سرد، وہی نالہ پُر درد۔ وہی دل، وہی دماغ، وہی جگر، وہی داغ۔ وہی نفاق، وہی اتفاق، وہی وصال، وہی فراق۔ وہی معشوقوں کی بے وفائی، وہی جذبِ دل کی نارسائی۔ وہی جلادوں کی چھری تیز، وہی نظر وہی غمزۂ خوں ریز۔ وہی سوز، وہی ساز، وہی راز، وہی نیاز۔ وہی ساقی، وہی پیمانہ، وہی شراب، وہی خم خانہ۔ غرض کہ ہر بات وہی ہے، دن وہی رات وہی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ کچھ فرق نامعلوم سا ہے تو ہم کہیں گے کہ وہ معدوم سا ہے۔ اگرچہ[2] امور ظاہر میں کچھ تفاوت نظر آتا ہے مگر احوال باطن اور کیفیات ذہنی میں کوئی امتیاز نہیں پایا جاتا۔ بے شک انسان میں ایجاد کا مادہ پیدا کیا گیا ہے، نئے نئے تماشوں پر اس کا دل شیدا کیا گیا ہے مگر اپنے مزاج کی تجدید پر مختار نہیں۔ سرحد ادراک سے آگے جانا اس

---

[1] بیان وجہ تالیف مرقع لہٰذا شروع ہوتا ہے، اس کا ذکر منظور ہے کہ طبیعت انسانی ہمیشہ ایک ہی وتیرے پر رہتی ہے۔

[2] یہاں سے نثر میں قافیے کی قید کو ترک کیا ہے۔ انسان کی حالت بہ اعتبار جبر و اختیار کے بیان کی جاتی ہے۔

کی طاقت سے باہر ہے۔ کیا مجال ایک قدم آگے بڑھا سکے۔ البتہ انسان بالکل مجبور نہیں، کچھ کر سکتا ہے، کچھ اٹھا سکتا ہے، کچھ دھر سکتا ہے مگر اتنے سے اختیار پر نازاں نہ ہونا چاہیے۔ جو دوڑ کر چلے گا، گر پڑے گا، جتنا بنے گا اتنا ہی بگڑے گا۔ یہ تو سمجھو کہ ہم کیا ہیں، کیا نہیں، آخر انسان ہیں، خدا نہیں۔

ہمارے[1] بعض احباب نے اہل یورپ کی شاعری پر توجہ فرمائی ہے، اپنی زبان کو بگاڑ کر ایک نئی چیز بنائی ہے۔ بڑی بڑی انشا پردازیاں ہوتی ہیں، خوب خوب سحر سازیاں ہوتی ہیں۔ کوئی صاحب ہندی کی چندی لکھنے پر فریفتہ ہیں، کوئی صاحب انگریزی قصول کے لفظی ترجمے پر غش ہیں۔ ہم بار بار کہہ چکے ہیں، افراط و تفریط ہر صورت میں ناجائز ہے۔

---

[1] قریب پچاس برس کے گزرے ہوں گے کہ ہمارے ملک میں ترمیم و اصلاح کا چرچا شروع ہوا ہے۔ ہر ایک تعلیم یافتہ شخص کو ملک اور قوم کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا ہے۔ ہمدردیٔ قومی کا نام ہر ایک شائستہ جلسے میں کئی بار لیا جاتا ہے۔ جہاں دیکھو ترمیم کی فکر ہے۔ کوئی صاحب ترک خیالات مذہبی کی قسم کھائے ہوئے ہیں، کہیں اصلاح طرز معاشرت کا ذکر ہے، کہیں اردو زبان کی ترمیم کا خیال ہے۔ ایک صاحب اردو زبان کی ترقی سے مایوس ہو کر صلاح دیتے ہیں کہ اس زبان کو قطعاً ترک کر دینا چاہیے، اور کوئی زبان زبان ہائے یورپ سے اختیار کرنا چاہیے، خصوصاً انگریزی۔ اور لطف یہ ہے کہ وہ صاحب خود انگریزی اور نہ کوئی اور زبان زبان ہائے یورپ سے جانتے ہیں (فاعتبروا یا اولی الابصار) مصنف کا خیال ہے کہ ملک کی ترقی کے ساتھ زبان کی ترقی یا تنزلی جو سمجھو خود ہی ہوتی جائے گی۔ ہمارا تمھارا کام نہیں ہے کہ زبان کی ترقی کریں۔ ہماری یہ کوشش ہونا چاہیے کہ جس زبان میں ہمارے ملک کے شرفا گفتگو کرتے ہوں اسی کو تحریر و تقریر میں اختیار کریں۔

اعتدال سے کام لو، زبان کی اصلاح ایک شخص کا کام نہیں۔ جو کچھ آپ سے ہو جائے، اسے ہونے دو، اپنی طرف سے نہ بناؤ نہ بگاڑو، آئندہ اختیار ہے، قلم تمھارے ہاتھ میں ہے۔ اہل اخبار خشک و تر جو کچھ مل جائے، اس کے چھاپ دینے کی قسم کھائے ہوئے ہیں۔ بعد تصنیف رسالہ "استشعار[1] فی توجیہ الاشعار"

---

[1] رسالہ "استشعار فی توجیہ الاشعار" جس کا مختصر اور عام فہم نام "شگوفہ (بلاغت)" رکھا گیا ہے، تصنیف ہو چکا ہے، آج کل اس پر نظر ثانی ہو رہی ہے۔ اس کتاب میں علم نفس کی رو سے شاعرانہ تخیل پر نظر کی ہے۔ تمہید کتاب میں شاعری اور فلسفے کے تعلقات کا ذکر کیا ہے، پھر شعر گوئی اور شعر فہمی کی توجیہ کی ہے۔

باب اول میں شعر کا تعلق فلسفۂ نفس سے بیان کیا گیا ہے۔ اس باب میں قوائے ذہنیہ کی تشریح ایک مختصر مگر واضح طور سے بیان کی ہے۔ تخیل جس کو شعر سے تعلق ہے ایک علیحدہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ایک فصل میں حواس و محسوس اور مسئلۂ لذت و الم کو ذکر کیا ہے۔ افلاطون کا مذہب اس باب میں بیان کیا ہے اور اسی کو اختیار کیا ہے۔

باب دوم میں کیفیات ذہنیہ کو بیان کیا ہے، پھر کیفیات ذہنیہ کی تقسیم بیان کی ہے۔

باب سوم تخیل ماذج کے بیان میں ہے۔ تخیل ماذج وہ تخیل ہے جو مداخلت قوت فکری سے مبرا ہو۔ مضامین شعری میں یہ تخیل نہایت موثر ہے مگر اس پر آج تک کبھی نظر نہیں گئی۔ تخیل ماذج کی تشریح میں بہت سی کیفیات ذہنیہ کو بیان کیا ہے اور ان کی مثالیں استادوں کے کلام سے پیش کی ہیں۔

باب چہارم میں تخیل مرکب کو بیان کیا ہے۔ اس باب میں علم بیان کو ایک جدید طریقے سے حل کیا ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جس کا چھوٹا سا نام "شگوفہ (بلاغت)" ہے، جی چاہتا تھا کہ اب ایک ایسی کتاب نظم و نثر میں تحریر کروں جس میں اکثر اصناف شعر شامل ہوں تاکہ متعدد کیفیات ذہنیہ کا مختلف طور سے بیان ہو جائے۔ از بس کہ طراغودیا[1] یا بہ قول اکثر حکما اجود اصناف شعر سے ہے، اور اس میں کل اور قسمیں شامل ہو سکتی ہیں لہذا اسی کو تجویز کیا۔ اب یہ خیال تھا کہ کون سا قصہ پر غم اور واقعۂ ماتم والم لکھوں جو عموماً طبائع اہل ہند کو مرغوب ہو۔ "الف لیلہ" الٹ پلٹ کے دیکھتا تھا کہ انھیں دنوں میں بعض احباب[2] کے اصرار سے متواتر تھیٹر کے جلسوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا۔ یہ مذاق پہلے بھی پسند تھا۔ اب کے دوستوں کے اصرار سے زیادہ لطف آیا۔ تماشا کرنے والوں کی پیاری پیاری صورتیں ان کا ناز و انداز، رونا دھونا، جان کھونا سب کچھ دل کو بھایا مگر لب و لہجہ روزمرہ پسند نہ آیا۔ یہ دل بے قرار جہاں جاتا ہے، ایک نئی بات سمجھاتا ہے ذوق شعر و سخن بچپن سے طبیعت میں ہے، نشو و نما ایسے شہر میں پائی، شاعری جس کی طینت میں ہے۔ حیران تھا کہ یہ کس شہر کی بولی ہے جو ان لوگوں کی زبانی سنتا ہوں۔ سمجھ میں تو آتی ہے مگر اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ ایک شفیق سے معلوم ہوا کہ یہ نظم و نثر دہلی لکھنؤ سے کوئی تعلق نہیں رکھتی، بمبئی کے مچھلی بازار

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

باب پنجم اقسام شعر کے ذکر میں ہے۔ اس باب میں کئی اعتباروں سے مضامین شعریہ اور نظم و نثر کے اصناف کو بیان کیا ہے۔ خاتمۂ کتاب میں اور بعض امور متعلق شعر بیان کیے ہیں۔

[1] "طراغودیا" وہ قصہ جس کا انجام غم پر ہو، دیکھو فرہنگ۔

[2] احباب: سید شہنشاہ حسین صاحب رضوی بی اے، سید بہادر علی خاں عرف ابو صاحب اور مولوی عبدالحلیم صاحب شرر

کی بول چال ہے، یہ دسا در دہیں کی ہے، دہیں کا مال ہے۔ میں نے دل میں کہا شکر ہے کہ اس مہملات کو ہماری[1] زبان سے کوئی تعلق نہیں۔ ذوق سخن سرائی نے

---

[1] ہم لکھنؤ والوں کو جس زبان پر اس قدر ناز ہے، اگر سچ پوچھو تو وہ فی الحقیقت دہلی ہی کی زبان ہے، اس لیے کہ لکھنؤ میں جن لوگوں کی زبان قابل اعتبار ہے ان کے آبا و اجداد اوّلاً دہلی سے فیض آباد میں اور پھر وہاں سے لکھنؤ میں آکر آباد ہوئے۔

سب کو جانے دو، وہ خاندان جو ایک مدت تک سرزمین اودھ پر کارفرما رہا، دہلی کے معزز اور نام برآوردہ نوابوں میں سے ایک نواب کی اولاد ہے۔

ان نو آباد لکھنؤ والوں نے مثل اور جائداد کے زبان بھی اپنی اولاد کو ورثے میں دی۔ ان لوگوں کی اولاد کے لیے یہ فخر کیا کم ہے کہ انھوں نے اپنے آبا و اجداد کے وطن کی زبان کا تا حدّ امکان تحفظ کیا بلکہ اس میں کسی قدر ترقی بھی کی جس کو اہل دہلی نے اکثر وجوہ سے تسلیم بھی کیا۔

سرزمین لکھنؤ کے اصلی باشندے اکثر شیخ زادے یا باج پیٹی برہمن ہیں۔ ان لوگوں کی وہ زبان تھی جو آج تک لکھنؤ کے اطراف و جوار میں بولی جاتی ہے جس کو لکھنؤ والے گنواری یا پوربی زبان کہتے ہیں۔ لکھنؤ کے ان اصلی اور قدیمی باشندوں کو اپنے حسب و نسب کے تحفظ کا حد سے زیادہ خیال ہے اور اب بھی وہی دستور ہے۔ یہ لوگ سوائے اپنے خاندان کے اور کسی اچھے خاندان سے خواہ وہ کیسا ہی معزز اور شریف کیوں نہ ہو، تعلق نسبتی نہیں کرتے۔ میرا خیال ہے کہ تمام ہندستان کے شریف دہقانوں کا یہی دستور ہے۔ مشہور ہے کہ کسی نواب اودھ نے اپنے یا اپنی اولاد کے لیے ایسا چاہا تھا مگر شیخ زادوں نے منظور نہیں کیا۔ اس اجتناب و احتراز کی وجہ سے اگرچہ ان لوگوں کے مردوں کی زبان تو دہلی والوں کے ساتھ میل جول کرنے کی وجہ سے بہت کچھ بدل گئی مگر مستورات کی زبان میں بہت کم فرق آیا۔ بچوں کی زبان میں ماں کی زبان کا کچھ اثر ضرور

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

صلاح دی کہ تو بھی انھیں متعارف نسخوں سے کوئی قصہ لے کر مرقع بنا۔ دوستوں کو جو اس قصد کی اطلاع ہوئی، مجھ کو اور بھی دیوانہ بنایا، اصرار کو حد سے بڑھایا کہ اگر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

ہونا چاہیے، اس لیے ان کے مردوں کے لہجے میں بھی آج تک فرق پایا جاتا ہے۔ دہلی والوں کی اولاد جو لکھنؤ میں آباد ہے، ان کی شادی بیاہ کی رسمیں بھی لکھنؤ کے قدیم باشندوں کے رسوم سے بالکل مختلف ہیں۔ پس لکھنؤ میں دو قسم کے باشندے سکونت پذیر ہیں، ایک وہ جن کو دہلی سے تعلق ہے، دوسرے وہ جن کو نہیں ہے۔ پہلی قسم کے باشندے سوائے اپنے خاندان کے اور شریفوں میں بھی شادی بیاہ کرنے سے مضائقہ نہیں کرتے، دوسرے وہ جو صرف اپنی برادری میں نسبت ناطہ کرتے ہیں۔ جب ان لوگوں نے ان لوگوں سے ایسا تعلق نہ کیا تو وہ مجبور تھے کہ اپنے وطن شریف دہلی والوں سے جو ان کے ساتھ یا پیشتر یا بعد وہاں سے آئے تھے، اس قسم کا تعلق کرتے، اس وجہ سے ان کی اصلی زبان کا تحفظ ہوا۔ ان لوگوں کی مرد عورت دونوں کی زبان حقیقت میں دہلی کی زبان ہے اور دوسرے قسم کے باشندوں کی زبان اردو پوربی آمیز ہے جس کو قصباتی زبان کہتے ہیں۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ جو لوگ مدت سے لکھنؤ میں سکونت پذیر ہیں، ان کے مردوں کی زبان میں پوربی کی آمیزش بہت کم ہے مگر پھر بھی اپنی اصلی زبان کے ایک دو لفظ بول جاتے ہیں۔ اگر اس کا بھی بہت تحفظ کیا ہے تو لب و لہجہ میں امتیاز ضرور ہے۔ پس اس قسم کے باشندے کی زبان مادری دہقانی ہے اور اول قسم کے باشندوں کی مادری و پدری اردو ہے، اردوے معلّٰی نہیں کہتا اس لیے کہ دہلی والے برا نہ مانیں لیکن بہ قول غالب مرحوم کے یہ بھی کہوں گا کہ جب اردو بازار نہ رہا تو اردوے معلّٰی کیسی۔ اگر اردوے معلّٰی اس زبان سے مراد ہے کہ جو غالب مرحوم کے زمانے میں یا اس سے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

فسد ہے تو پھر دیر کیا ہے۔ آج کل تم کو فرصت ہے، جو دم ہے غنیمت ہے، خدا جانے کہاں جانا ہو، کہاں رہنا ہو، یہ جوش رہے یا نہ رہے، یہ شوق رہے یا نہ رہے حسن و عشق کے قصوں میں لیلیٰ مجنوں کا افسانہ (جس تو تاریخی واقعے کی وقعت حاصل ہے) عموماً مشرقی طبائع کو مرغوب ہے، واقعی بہت خوب ہے۔ دل نے اسی کو اختیار کیا، چند نمائشیں کہہ کر حضرت استادی و مکرمی جناب مرزا محمد جعفر صاحب اوج (مدظلہ العالی) کی خدمت میں لے جا کے سنائیں۔ بعد حک و اصلاح ارشاد فرمایا "مناسب ہے کہ تمام بحور مرقع میں آجائیں تاکہ مبتدی موزوں طبعوں کو مفید تر ہو"۔ تعمیل حکم حضرت استاد کو عین سعادت سمجھ کے اس پر بھی کاربند ہوا، اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی خیال رہا ہے کہ ہر ایک بحر کا نظم موسیقی موافق اس حالت کے ہو جس حالت کا اظہار شعر سے مطلوب ہے، اور یہ امر اہل ذوق و استشعار سے پوشیدہ نہ رہے گا۔

قیس کے دیوان (جس کا مدوّن والہی ہے) کے مدوّن نے یہ تکلف کیا ہے کہ ہر ایک غزل کے پیشتر اس موقع اور روداد کو بھی بیان کر دیا ہے جہاں پر اس غزل کا انشاء واقع ہوا۔ یہ دیوان بجائے خود ایک تاریخ قیس کی سوانح

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

پیشتر دہلی میں بولی جاتی تھی، تو وہ اب نہ دہلی میں ہے نہ لکھنؤ میں۔

دہلی اور لکھنؤ کی زبان میں آج جو کچھ فرق ہے، اس کی وجہ سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کے لیے کوئی معیار موجود نہیں ہوا ہے، اس لیے کہ دونوں شہروں کے شعرائے متاخرین کو ہم اپنا پیشوا بنائیں اور ان کی پیروی کو اپنا فخر سمجھیں، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ رسم و رواج اور مرور ایام کی وجہ سے جو الفاظ اور محاورات ہماری زبان میں گھل مل گئی یا متروک ہو جائیں، ان کو اختیار یا ترک کریں۔ ایسا ہی اب تک ہوا ہے اور یہی ہوگا، فتامل۔

عمری کی معلوم ہوتی ہے، گو کہ اس میں شاعرانہ مذاق کو بہت کچھ دخل دیا گیا ہو۔ میں ان واقعات کو کلیۃً اختیار نہ کرنے پر مجبور ہوا، اس لیے کہ اکثر مضامین اس دیوان میں ایسے ہیں جو ہمارے ملک اور نیز فارس کے شاعرانہ مذاق کے بالکل مخالف ہیں، پھر بھی تاحدِ امکان اکثر واقعات اسی دیوان سے لیے ہیں۔ نمائش ہر ایک روداد کی گویا کہ ہندستان میں رکھی گئی ہے تاکہ ہم وطن مسلمانوں کے طرزِ معاشرت کو کسی نہ کسی پیرائے سے بیان کرنے کا موقع ملے۔ جو واقعات قیس کے ہیں، اس کو اصلی جوش و خروش کے ساتھ وہی بیان کر سکتا ہے جس کے دل پر گزری ہو۔ ہم نے قیس کے نفس کو اپنی ذات پر قیاس کر کے جو چاہا لکھا، ہم اس غریب کو کیا جانیں مگر اتنا کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے نفس پر کسی ایسی ہی حالت میں گزرتا ہے، کچھ ایسا ہے یا اس سے کم یا زیادہ اس پر بھی گزرا ہو گا ؎

جب کیا مجنوں کی تصویرِ خیالی کا خیال
لے لیا بہزاد نے خاکہ مری تصویر کا

اس کتاب کے حاشیے پر بحر اور وزن شعر کے سوا اور اور باتیں بھی جو میرے دل میں آئیں، لکھ دیں۔ عجب نہیں ہے کہ ناظرین کو مفید ہوں۔ مصنف کے لیے شاید یہ فخر بجا ہو کہ یہ پہلا مرقع ہے جو مسلّم الثبوت شعرائے دہلی و لکھنؤ کی زبان میں کچھ کہنے کے قصد سے لکھا گیا ہے۔ رہا یہ امر کہ میں کس حد تک اس کوشش میں کامیاب ہوا، یا بالکل نہ ہوا، ناظرین کے انصاف پر موقوف ہے۔

کس طرح وہ سمجھیں گے الٰہی مرے دل کی
ہے میری زباں اور فرشتوں کی زباں اور

لکھنؤ۔ دسمبر ۱۸۸۷ء

مرزا محمد ہادی

یہ ہے اپنے بابا کی آنکھوں کی پتلی — یہ اماں کا دل دار پیدا ہوا ہے
یہ لڑکا ہے سب قوم عامر کو پیارا — یہ کنبے کا سالار پیدا ہوا ہے
سینوں کا دل کیوں نہ ہو اس پہ صدقے — یہ بانکا طرح دار پیدا ہوا ہے
مثل ہے کہ ہوتے ہیں اچھوں کے اچھے — یہ بچہ خوش اطوار پیدا ہوا ہے
کھلی اس کے ہونے سے قسمت ہماری — غریبوں کا غم خوار پیدا ہوا ہے

چوتھا سین دیوان خانہ

عبداللہ

ارے[1] کوئی حاضر ہے یاں؟ جلد جائے — ابھی اپنے ہمراہ کاہن کو لائے

خدمت گار

بہت[2] خوب ابھی جا کے لاتے ہیں ہم — جہاں وہ ملے گا بلاتے ہیں ہم

(خدمت گار جاتے ہیں، کاہن کو لے کے آتے ہیں)

---

[1] صنف کلام: مثنوی بحر متقارب سالم و مزاحف۔ وزن: فعولن فعولن فعولن فعولن، دو بار۔

[2] وزن فعولن فعولن فعولن فعل۔ صرف یہ شعر اس وزن پر ہے۔ باقی تمام اشعار کا وزن سالم ہے۔ اس نمائش میں کاہن کا بلانا، اس کا آنا اور گفتگو وغیرہ بیان کی ہے۔ یہ رسم ہندستان میں غیر شرع مسلمانوں میں جاری ہے۔ مولود کا زائچہ (جنم پتری) کھینچوایا جاتا ہے، امر شرع شریف کے بالکل خلاف ہے۔

کاہن

کیا آج[1] کاہن کو کیوں سرفراز خداوند کی عمر ہوئے دراز!

عبداللہ

پسر کا مرے کھینچ تو زائچا ذرا حال قسمت کا اس کے بتا

کاہن

(زائچہ بنا کے اور انگلیوں پر شمار کر کے)

یہ لڑکا بڑا صاحب نام ہوگا حسینوں سے اس کو سدا کام ہوگا
کسی کی محبت کا یہ دم بھرے گا نہ اس بن جیے گا نہ اس بن مرے گا
بہت اس کی طینت میں ہو پاک بازی حقیقی بنے اس کا عشقِ مجازی
کہیں گے اسے لوگ وحشت کا پُتلا پھرے گا بہت دن یہ صحرا بہ صحرا
محبت کا آزار گھڑیوں بڑھے گا جنوں بن کے جن اس کے سر پر چڑھے گا
محبت اسے پھر ٹھکانے لگا دے خودی سے چھڑا کر خدا سے ملا دے
اگر نام پوچھو تو ہے قیس بہتر مگر لوگ مجنوں کہیں اس کو اکثر
مبارک ہے یہ نام اور وہ لقب بھی سعادت ہے یہ عشق اور وہ طلب بھی
جنوں اور وحشت میں یہ بے بدل ہو یہ لڑکا محبت میں ضرب المثل ہو

---

[1] جو لوگ علم نجوم کو حق نہیں مانتے وہ اس کو اتفاق کہہ سکتے ہیں۔ قصد شاعر اس نظم میں یہ ہے کہ کاہن کی زبانی مجنوں کی سوانح عمری کو جو اس کی ولادت کے وقت شروع ہوئی تا انجام حیات ایک ایسی تقریر میں بیان کی جائے کہ اگر وہ بالفرض عبداللہ کے سامنے بیان کی جاتی تو اس کو خلاف نہ گزرتی، اور وجہ خلاف نہ گزرنے کی یہ ہے کہ کاہن عشق مجازی سے ابتدا کر کے فوراً عشق حقیقی کو شروع کر دیتا ہے اور عشق حقیقی کے بیان کے بعد مجنوں کے مصائب کو جو ذکر کرتا ہے، وہ کسی باپ کو جو مسلمان ہے برے نہیں معلوم ہو سکتے، اس لیے کہ اللہ کی راہ میں مرجانا ہمارا عین ایمان اور مقصود اعلیٰ ہے۔

عجب گُن ہیں اس کے عجب کام اس کے — ہزاروں ہی دنیا میں ہوں نام اس کے
سنو نام کا اس کے اسرار تم اب — کہ ہر حرف میں ہے نہاں ایک مطلب
کہ ہے 'قاف' سے یہ قتیلِ محبت — ہوئی 'یا' سے کچھ یادِ جاناں کی صورت
کھلا 'سین' سے یہ سراپا الم ہے — سیہ بخت ہے سینہ چاکِ ستم ہے
ملے ہیں جو سب حرف اس میں ہے یہ سر — کہ ہو وصل کا اس کے انجام آخر
نہ پوچھو کہ کیوں قاف سے ابتدا ہے — کہ یہ عشق میں حرفِ آخر پڑا ہے
زمانے میں جو عشق کی انتہا ہو — وہ اس طفل کے عشق کی ابتدا ہو
نہ پوچھو کہ کیوں درمیاں حرف 'یا' ہے — کہ بس یار ہی یار دل میں بسا ہے
پڑا 'سین' آخر میں اس کا سبب کیا — کہ آخر سعادت ہے انجام اس کا
یہ بدنام ہو کر نکو نام ہو گا — وہ آغاز ہو گا یہ انجام ہو گا

عبد اللہ (خدمت گاروں سے)

کاہن کو یہاں سے لے کے جاؤ — انعام خزانے سے دلاؤ

(دل میں)

قسمت[1] کی کسی کو کیا خبر ہے — اللہ کے ہاتھ سر بہ سر ہے

---

[1] صنف کلام: مثنوی بحر ہزج مجزو اخرب مقبوض محذوف۔ وزن: مفعول مفاعلن فعولن۔ قصد شاعر: اس کا بیان کہ عبد اللہ کاہن کے اس کلام سے کیا نتیجہ نکالتا ہے۔ عبد اللہ پر حالت مسرت شدید کی طاری ہے۔ کاہن کی ذہنی گفتگو سے اس کی وہ مسرت زائل نہیں ہو سکتی۔ جو کچھ الم اس کو ہوا اس کو مذہبی خیالات سے ٹال رہا ہے اور اس ذہنی مجادلۂ لذت والم میں لذت کو کامیابی ہوتی ہے اس نمائش کو کسی قدر تاریخ سے مناسبت ہے اس لیے کہ وہ زمانہ شروع اسلام کا تھا ہر ایک باایمان مسلمان کے دل میں جوش مذہبی بھرا ہوا تھا، ہر ایک سچے مسلمان کا یہ مقصد اعلیٰ تھا کہ میں اور میری اولاد جہاد میں نام آوری پیدا کرے۔

انجام میں ہو اگر بھلائی ہو پہلے بدی تو کیا برائی
بے شک یہ پسر ہے صاف باطن کہتا نہیں ہے صاف کاہن
بے شک یہ پسر ہے باسعادت ہے اس کے نصیب میں شہادت
عشقِ مولا کا دم بھرے گا اللہ کی راہ میں مرے گا
یہ طفل مرا سعید ہو گا یہ طفل مرا شہید ہو گا

پانچواں سین محل سرا (عبداللہ کی ڈیوڑھی)

محل دار (چلاّ کے)

ڈیوڑھی[1] پہ ارے یہاں کوئی ہے کب تک چلاؤں کوئی بھی ہے

---

[1] صنف کلام: مثنوی بحر ہزج واخرب مجز واخرب مقبوض محذوف۔ وزن: مفعول مفاعلن فعولن۔ اخرام اشتر محذوف۔ وزن: مفعولن فاعلن فعولن۔ قصد شاعر اس نمائش میں:

محل سرا (یعنی مکان زنانہ، جائے سکونت محلات وصاحبات امرا) کے دروازے پر جو امور واقع ہوتے ہیں، ان میں سے بعض امور کا ذکر منظور ہے محل دار اس عورت ملازمہ کو کہتے ہیں جو بیگم صاحبہ کے حکم احکام باہر نوکروں تک پہنچاتی ہے اور باہر کی اطلاع یابی اور عرض ومعروض اندر محل میں لے جاتی ہے یہ عہدہ اکثر مسن اور فہمیدہ عورت کو دیا جاتا ہے۔ باہر کے نوکر چاکر اس سے ڈرتے رہتے ہیں کیوں کہ اس کی رسائی بیگم صاحبہ تک ہے، موقوفی بحالی تک میں اس کو دخل ہے۔ جو نوکر چاکر اس سے ملتے رہتے ہیں، وہ اکثر بیگم صاحبہ کی خفگی اور سخت کاموں سے بچتے ہیں۔ دایہ (جس کو لکھنؤ میں عموماً "اناجی" کہتے ہیں) وہ عورت ہے جو طفل کو دودھ پلاتی ہے۔ امیر عورتیں اپنے بچوں کو خود دودھ نہیں پلاتی ہیں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(جھنجلا کے اور خوب چیخ کے)

دیکھو کب سے پکارتی ہوں مردہ بول اٹھے کوئی ہاں، ہوں

خدمت گار

(محل دار سے مخاطب ہو کر)

کہیے کیا حکم ہے محل دار آواز تو دے رہا ہوں ——

(چپکے سے) مردار[1]

محل دار

ہے قیس کا آج حال ابتر لے آ کاہن کو جلد جا کر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

اناجی اکثر شریف مگر نہایت غریب گھرانے کی ہوتی ہے۔ جو عورتیں اس نوکری کو قبول کرتی ہیں وہ اپنے کنبے میں نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ کوئی شریف خاوند اس کو جائز نہیں سمجھتا کہ اس کی عورت کسی بچے کو کچھ ماہ واری لے کر دودھ پلائے۔ عزیزوں کے لڑکے کو مفت دودھ پلانا بہ رضائے خاوند کچھ ایسا عیب نہیں ہے۔ اناجی کے حقوق بہت کچھ ہوتے ہیں۔ وہ عورت جو اجورہ لے کے دودھ پلائے اس کو انا کہہ سکتے ہیں۔

[1] محل دار اور اس کے ماتحت ملازموں میں جو نااتفاقی ہو جاتی ہے، تو ایسے ہی کچھ نتیجے پیدا ہوتے ہیں۔ اناجی کی عزت محل میں بہت ہوتی ہے۔ خود نواب صاحب اور بیگم صاحبہ اس کی عزت کرتی ہیں۔ اور اس کے حقوق بھی بہت ہوتے ہیں۔ جس لڑکے کو وہ دودھ پلاتی ہے، وہ اس کا 'پلایا' کہلاتا ہے۔ ہر ایک پلائے کی شادی میں امرا کی سرکار سے ایسا کچھ ملتا ہے کہ وہ عمر بھر کے لیے مالا مال ہو جاتی ہے۔ انا کو بھی اپنے پلائے سے بہت محبت ہوتی ہے۔ انا اور کاہن کی گفتگو میں نجومیوں کی فال کھولنے اور جاہل عورتوں کی سریع الاعتقادی کی صورت ایک شاعرانہ طریقے سے دکھائی گئی ہے۔

نوکر

(محل دار سے مخاطب ہو کر)

تو اس کو ابھی میں جا کے لایا

(کاہن کو لا کے، ڈیوڑھی پر پکار کے)

کہہ دو انّا سے کاہن آیا

(دایہ طفل کو پردے کے باہر لے کے آتی ہے)

کاھن

انّا جی سلام، کہیے کیا حکم لاؤں میں آپ کا بجا حکم

دایہ

(کاہن سے مخاطب ہو کر، طفل کو دکھا کے)

کاہن تو جلد فال تو کھول بچے کا مرے حال تو کھول
اس بچے پہ یہ بجوگ کیا ہے کاہن! آخر یہ روگ کیا ہے
بھولے سے نہیں کبھی یہ سوتا سوتا ہے، خواب میں ہے روتا
کیا بات کسی نے تھی کہی یہ سوتا نہیں خواب میں کبھی یہ
پہروں نہیں ہائے دودھ پیتا کیا جانے یہ کس طرح ہے جیتا

(گویا اس کی گود میں دے دیتی ہے)

تو دیکھ تو کیا بساط اس کی مرجائے کہیں نہ دائی بندی

(آسمان کی طرف دیکھ کر)

آئی ہو جو اس کی مجھ پہ آجائے سر سے اس کے الا بلا جائے

کاھن

(فال کھول کے)

دایہ تجھے اس کی کیا خبر ہے
یہ عشق کا بھید سر بہ سر ہے

تو باغ[1] گئی تھی جھٹ پٹے وقت اس بچے کو لے گئی تھی بے وقت
وہ ہو نہ ہو پنج شنبے کا دن

دایہ

سچ ہے تیری یہ بات کاہن

کاہن

تھا گود میں تیرے یہ گل تر تھی سرخ کلاہ اس کے سر پہ
کرتے کا تھا رنگ زعفرانی اور گوٹ لگی تھی اس میں دھانی
اس وقت نہا کے تو اٹھی تھی؟

دایہ

کاہن! ہاں یہ خطا تھی میری

کاہن

چوٹی تیری کھلی ہوئی تھی پوشاک بتاؤں اب میں تیری
تھا اودے رنگ کا دوپٹا پہنے تھی سرخ پائجامہ

دایہ

کاہن کچھ اور حال بتلا سب سچ کہتا ہے تو کہے جا

---

[1] باغ کا سماں جو یہاں بیان کیا گیا ہے، اس میں وحشت اور بھیانک پن کا رنگ ملایا ہے۔ شاعر کا قصد ہے کہ لذت والم خوف ورحم کے آثار ایک ہی ساتھ پیدا کرے۔ باغ کے بیان میں لذت کی تخییل زیادہ ہوگی اور الم کی کم اور شمع وپروانے کی اس کے برعکس ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ آسیب کا تصور ایک تربیت یافتہ ذہن پر کم اثر پیدا کر سکتا ہے، گو کہ عورتوں کی تخییل پر اس سے بہت کچھ اثر ہوتا ہے مگر مردوں کی تخییل پر بہت کم لیکن جلنے کا تصور ہر شخص پر بہت اثر رکھتا ہے عام اس سے کہ تعلیم یافتہ ہو یا نہیں، مرد ہو یا عورت۔

اتنا تو بتا دے پہلے للہ — ہے جان کی خیر یا نہیں آہ؟
ہونا تھا جو اس کے واسطے یوں — ہے ہے! اسے لے کے میں گئی کیوں
کاہن یہ سب مری خطا ہے — بچے کا قصور اس میں کیا ہے

کاھن

سن دایہ کچھ اور حال اس کا — تا تجھ کو رہے خیال اس کا
تیرا بھی نہیں قصور اس میں — کچھ اور ہی ہے فتور اس میں
جب تو نے چمن کی سیر کی تھی — اک آگ سی واں لگی ہوئی تھی
پھولی ہوئی تھی شفق فلک پر — چلتی تھی ہوائے تند صرصر
سوسن بہ زبان بے زبانی — کہتی تھی عشق کی کہانی
پھولوں کی ہنسی تھی کچھ بھیانک — اک شور مچا تھا واں اچانک
وہ سرو، وہ سایہ، وہ لب جُو — اور واں پہ وہ قمریوں کی کُوکُو
واں تھا وحشت پری کا پھیرا — سیمرغ جنوں کا تھا بسیرا
اک چڑیا پھُر سے اُڑ گئی تھی — تو دیکھنے جس کو مُڑ گئی تھی
تھا حضرتِ عشق کا تو سایہ — ناگہہ دیوِ الم بھی آیا

(حضرتِ عشق کے نام پر دایہ کا بلائیں لینا)

سنسنے پہ گلوں کے کھِل کھِلا کر — اک بار ہنسا تھا یہ گلِ تر
نرگس کے پاس رو دیا تھا — کچھ ہو کے اداس رو دیا تھا
سنبل سے یہ پیچ و تاب میں تھا — سبزے کے قریب خواب میں تھا
ناگہہ بلبل کی آئی آواز — آواز میں کچھ تھا سوز کچھ ساز
سوتے میں سے چونک اٹھا یہ بے تاب — اس وقت یہ ہو گیا تھا بدخواب
کیا خواب میں دیکھتا ہے یہ گل — ہے یاس امید عشق بالکل
شبنم کو اس نے روتے دیکھا — بلبل کو جان کھوتے دیکھا
پامال خزاں یہ باغ دیکھا — لالہ کے جگر کا داغ دیکھا

سمجھا کہ یہ عشق کی سزا ہے — اس باغ کی بس یہی ہوا ہے
یہ حضرتِ عشق کا عمل ہے — آسیب جنوں کا کچھ خلل ہے
وحشت کا ہے اس کے سر پہ سایا — سودا کچھ دل میں ہے سمایا۔

دایہ

کاہن بتلا کوئی اتارا — جینے کا تو اس کے ہو سہارا
اس بچے کے حال پر ترس کھا — اس حسن و جمال پر ترس کھا

کاھن

کچھ خوف تو جان کا نہیں ہے — اس دکھ کی مگر دوا نہیں ہے
کیا اس کا بتاؤں میں اتارا

دایہ (ہاتھ جوڑ کے)

کاہن! بتلا تو کچھ خدارا

کاھن

دایہ! ہے عشق کی دوا حُسن — ہے عشق تو آگ اور ہوا حُسن
یہ آگ جو اس ہوا سے بھڑکے — جلنے والا کبھی نہ پھڑکے
جلنے کا مآل دیکھ لے تو — پروانے کا حال دیکھ لے تو
فانوس میں ہو جو شمع روشن — پروانے کی دیکھے کوئی اُلجھن
بے تابیٔ شوق کوئی دیکھے — جل جانے کا ذوق کوئی دیکھے
اندر شعلہ لپک رہا ہے — باہر یہ سر پٹک رہا ہے
فانوس کا پردہ ہے جو حائل — مضطر ہے یہ مثلِ نیم بسمل
پردہ جو درمیاں نہ ہوتا — اک بار جل کے جان کھوتا

دایہ

کاہن کچھ صاف صاف بتلا — میں تو سمجھی نہ یہ معما

کاھن

جینا اس کا اگر ہے مطلوب　　دکھلا اس کو جمالِ محبوب
یعنی کچھ لوگ خوب صورت　　کرتے رہیں جان و دل سے خدمت
پریوں میں یہ طفل پرورش پائے　　دکھ دور ہو دل کی سب خلش جائے

(پردہ گرتا ہے)

قیس (دل میں)

اے[1] معلم! ابھی نہ دے رخصت　　اور جی بھر کے دیکھ لیں صورت

مجنوں (ایک طرف ہو کر)

نہ مل یار سنگ دل سے نہ مل　　دلا[2] کوئے دل رُبا میں نہ جا
المِ ہجر، دردِ غم ہے ستم　　خدا را مجھے بلا سے بچا
نہ کر قہر، پھیر اُدھر سے نظر　　بلا ہے بلا وہ زلف رسا
نہ دے غم مجھے خدا کے لیے

چوتھا سین　خواب گاہ قیس

(پہلی شب فرقت۔ نالہ وزاری و بے قراری)

---

[1] صنف کلام: مطلع بحر خفیف وافی مخبون مسکن محذوف۔ وزن: فاعلاتن مفاعلن فعلن۔ قصد شاعر: اس تمام صحبت کا اس شخص کے دل پر کیا اثر ہوا جس کا خیال ایک ہی طرف متوجہ رہا۔

[2] صنف کلام: ابیات مثل مسمط چار خانہ۔ بحر پارسی بار بد یا یا جادو راہ۔ وزن: مفاعیل فاع لات فعل ایک بار۔ قصد شاعر: اظہار اس امر کا کہ مجنوں لیلیٰ کو دل دینے میں پس و پیش کرتا ہے۔ اس کو حالت زود کہتے ہیں۔

قیس

یا الٰہی[1] شب فرقت کی سحر ہو کہ نہ ہو
مجھ پہ بھاری ہے یہ شب، آہ بسر ہو کہ نہ ہو

درد فرقت سے مرے دم پہ بنی ہے یارب
اس کو کچھ میرے تڑپنے کی خبر ہو کہ نہ ہو

نالے کرنے دے مجھے ہجر میں اے بے اثری!
دل کی حسرت تو نکل جائے اثر ہو کہ نہ ہو

ہم تو دیکھا کیے کل پیار کی نظروں سے انھیں
اب خدا جانے ادھر ان کی نظر ہو کہ نہ ہو

ہدف تیر نگہ ہیں جگر و دل دونوں
دردِ دل ہو کہ نہ ہو دردِ جگر ہو کہ نہ ہو

اب تو بے سمجھے ہوئے دل کا کیا ہے سودا
نفع کچھ ہو کہ نہ ہو اس میں ضرر ہو کہ نہ ہو

کل بھی اے دل تجھے لے جائیں گے ہم یار کے پاس
نذر دیں گے اسے منظور نظر ہو کہ نہ ہو

پانچواں سین مکتب خانہ

(قیس و لیلیٰ کا دوبارہ دوچار ہونا)

قیس (دل میں)

اللہ نے پھر آج وہی شکل دکھائی
پھر ہم کو وہی چاند سی صورت نظر آئی

لیلیٰ (دل میں)

وہ چشم وہ ابرو وہ اشارہ نظر آیا
لو آج بھی ہم کو وہی پیارا نظر آیا

مولوی (لڑکوں سے)

اب[2] وقت سبق ہے آؤ لڑکو
سب اپنا سبق سناؤ لڑکو

لیلیٰ (معشوقانہ انداز سے)

'الف' ہے اک انوکھا حرف اسے اپنی ادا سمجھے
ہمارے بانکپن میں 'بے' ہے کیوں، ہم اس کو کیا سمجھے

---

[1] صنف کلام: غزل بحر رمل وافی مخبون محذوف۔ وزن: فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن دوبار۔ رکن آخر (فعلن) بعض مصرعوں میں مسکن (بہ سکون عین) لیا گیا ہے

[2] صنف کلام: بیت بحر ہزج مجز واخرب مقبوض محذوف۔ وزن: مفعول مفاعلن فعولن دوبار

تغافل 'تے' سے ہے اور 'ثے' سے ثابت ہے ثواب اس کا
جو سمجھے 'جیم' سے جلوہ تو 'حے' سے ہم حیا سمجھے
ہوئی 'خے'، 'دال' سے اور 'ذال' سے ہم خود نما ایسے
کہ دیوانوں کی ذلت اور رسوائی روا سمجھے
ہوا یہ 'زا'، 'سین'، 'شین' سے اور 'صاد' سے حاصل
کہ زیب اور سادگی اور شرم کو صبر آزما سمجھے
کھلا یہ 'ضاد'، 'طا'، 'ظا'، 'عین'، 'غین' سے مضمون
ضیا طلعت کی سمجھے ظلم و عشوہ غم فزا سمجھے
ہوا یہ 'فا'، 'قاف'، 'کاف'، 'لام'، 'میم' سے روشن
فریب قتل سمجھے اور کرشمہ مہ لقا سمجھے
یہ 'نون'، 'واؤ'، 'ھا'، 'یا' سے ہم مطلب سمجھتے ہیں
کہ ناز و وصل و ہم خوابی کو ہم یوسف لقا سمجھے

مجنوں (عاشقانہ طرز سے)

'الف' سے ابتدائے الفتِ اہل ادا سمجھے
اسی کو ابتدا سمجھے اسی کو انتہا سمجھے
نہ سمجھے 'بے' سے کچھ ہم بے نوا لیکن بلا سمجھے
بری ہے بے وفائی عشق میں اس کو برا سمجھے
نہ سمجھے 'تے' سے ہم تفتہ جگر تاریک دل لیکن
تغافل تلخ تر ہے اس کو ہم ترکِ وفا سمجھے
یہ ہے 'ثے' کا اشارہ، عشق میں ثابت قدم رہنا
نہ سمجھے 'جیم' سے ہم کچھ مگر جور و جفا سمجھے
ہوئی 'حے' سے عیاں حیرت کہ جب ہے حسرت و حرماں
ہوئی 'خے' سے خرابی خود نمائی سے خدا سمجھے

دلِ دیوانہ سمجھا 'دال' سے اک درد کا پہلو
نہ سمجھے درد کو ہم کچھ مگر دل کی دوا سمجھے
جو ذلت 'ذال' سے سمجھے تو 'رے' سے سمجھے رنجوری
نہ سمجھے 'زے' کو لیکن زخم اور زحمت فزا سمجھے
ستم ہے 'سین' سودا 'شین' ہے شور و شغب بالکل
جو سمجھے 'صاد' صحرا کو تو ہم صبر آزما سمجھے
ضلالت 'ضاد' سے ہے 'طوئے' سے ہے طوق گردن کا
نہیں ہے 'ظوئے' لیکن ظلم اسے ظلمت نما سمجھے
اگر ہے 'عین' عینِ عشق تو ہے 'غین' غینِ غم
جو 'فے' کو ہم فنا تو 'قاف' کو اپنی قضا سمجھے
نہیں ہے 'کاف' جز کا کل نہیں ہے 'لام' جز لیلیٰ
کبھی لب اس کو سمجھے اور کبھی زلفِ رسا سمجھے
مزا ہے 'میم' سے مرنے کا اور ہے 'نون' ناکامی
وفا کو 'واؤ' سے اور 'ہے' سے ہم ہائے ہوا سمجھے
یہ حرف 'یا' جو ہے دو بار نامِ یار میں آیا
نہ سمجھے اس کو ہم آخوند جی بتلاؤ کیا سمجھے

مولوی

"خوب سمجھے۔ میاں طرار! تم تو ذرا اپنا سبق سناؤ اور
تیزیٔ طبع کے جوہر دکھاؤ۔"

کسی کا خون نہ کرے یہ نگاہِ بے پروا
کسی کی جان نہ لے چشمِ فتنہ گر دیکھو
لگاؤ باد ہوائی نہ تیر نظروں کے
نشانہ تاک لو میرا دل و جگر دیکھو

کسی کے دم پہ بنی ہے یہ بے رخی کب تک
خدا کے واسطے لیلیٰ ذرا ادھر دیکھو

لیلیٰ

کوئی[1] بتائے کہ ہم کیوں بھلا ادھر دیکھیں — بلا کو اپنی غرض کیا جو اک نظر دیکھیں
یہ تیر کیا یہ نظر کیا، نہیں سمجھتے ہم — جو کچھ بھی ہو تو کسی کا دل و جگر دیکھیں
یہ چھیڑ چھاڑ کی باتیں ہمیں نہیں بھاتیں — ہے جھانک تاک سے نفرت ہمیں کدھر دیکھیں

(طنزیہ التجا کر کے دست بستہ)

نہ ایسی باتیں زباں پر پھر آنے پائیں کبھی — خدا کے واسطے صاحب، ذرا ادھر دیکھیں

مجنوں

نگاہِ قہر سہی دیکھ تو لیا تم نے — ہمارے جذبۂ دل کا ذرا اثر دیکھو

لیلیٰ (کھسیانی ہو کے)

یہ تم نے خوب کہی! خیر جو ہوا سو ہوا — قسم لو ہم سے جو اب تم کو عمر بھر دیکھیں

(خیلا آتی ہے)

خیلا (قیس سے مخاطب ہو کے)

یہ کیسی باتیں ہیں صاحب ذرا ادھر دیکھو — تمام شہر میں کر دوں گی میں خبر دیکھو

(لیلیٰ سے مخاطب ہو کے)

تمھاری ماں سے میں کہتی ہوں جا کے اے لیلیٰ! — نہ آنے پاؤ گی مکتب میں عمر بھر دیکھو

---

[1] قصد شاعر: اظہار انداز معشوقانہ حجاب کے ساتھ۔ لیلیٰ کے انداز معشوقانہ سے عاشقی کی ادا بھی نکلتی ہے اور یہ مصرع اس پر شاہد ہے:

جو کچھ بھی ہو تو کسی کا دل و جگر دیکھیں

لیلیٰ کو اپنی رسوائی کا بھی حد سے زیادہ خیال ہے اور ایک شریف زادی کو ہونا چاہیے۔

(دل میں)

سمجھ کے لائیں تھیں بیوی پھنسے گا ہم سے قیس

فدا وہ دل سے ہوا اس کمینی پر دیکھو

(لڑکے مع طرّار آتے ہیں)

(سب لڑکوں سے مخاطب ہو کے)

امیر زادیاں جب مفت میں کریں یاری

تو ہم غریبوں کی ہو کس طرح بسر دیکھو

طرّار

(خیلا سے، اپنی طرف اشارہ کر کے)

جو باتیں کرتے ہیں آپس میں قیس اور لیلیٰ

تمھیں ملال ہے کس بات کا، ادھر دیکھو!

چھٹا سین محل سرائے عبدالعزیز

(کمرۂ نشست مادرِ لیلیٰ)

(زہرہ آتی ہے)

زہرہ

(مادرِ لیلیٰ سے مخاطب ہو کر)

مجرا[1] ہو مرا قبول بیگم ہوں مطلب دل حصول بیگم

---

[1] صنف کلام: مثنوی (مرقع)، بحر ہزج مجزو اخرب مقبوض مقصور یا محذوف۔ وزن: مفعول مفاعلن فعولن یا فعولان، قصد شاعر: اظہار طرز معاشرت (بعض) روسائے اہل اسلام۔ اگر زہرہ ڈومنی ہے تو اس کی آمد و رفت زنانہ میں قابل اعتراض نہیں ہو سکتی کیوں کہ ایسی ڈومنیاں اکثر پردہ نشین ہوتی ہیں لیکن زہرہ پردہ نشیں نہیں ہے جیسا کہ اس کے مکتب میں جانے سے ظاہر ہے

بیگم

زہرہ کدھر آئیں کیا خبر ہے؟ نسبت کوئی لائیں کیا خبر ہے

زہرہ

نسبت کا نہ پوچھو حال بیگم
کس کو نہیں یہ ملال بیگم

اس وقت کے سب امیرزادے
شہزادے ہوں یا وزیرزادے

آوارہ مزاج ہو گئے ہیں
مفلس محتاج ہو گئے ہیں

ورثے کی امید پر جو لیں قرض
جورو کا ادا کریں گے کیا فرض

مرنا ماں باپ کا جو چاہیں
بی بی سے موئے وہ کیا نباہیں

اللہ کا ڈر نہیں ہے ان کو
کچھ خوف و خطر نہیں ہے ان کو

جلسوں میں شراب پی کے جانا
میلے ٹھیلوں میں غل مچانا

اچھے لوگوں سے ان کو نفرت
شہدے گرگوں سے ان کو صحبت

سیکھے کوئی نوج ان کا شیوہ
ہے گالی گلوج ان کا شیوہ

تاکیں جو رنڈیوں کا گہنا
کیا ان سے کسی کو ہو گا لہنا

کچھ شرم انھیں نہ کچھ حیا ہے
پھر ان سے کہو امید کیا ہے

بیگم

زہرہ سچ کہتی ہے تو بالکل
اس گھر کا چراغ بھی ہے اب گُل

وہ قیس جو ہے مرا بھتیجا
وہ جیٹھ کا میرے ہے جو بیٹا

اب کیا کہوں فخرِ خانداں ہے
یوں تو وہ جگر ہے میری جاں ہے

اطوار برے ہیں اس کے زہرہ
آثار برے ہیں اس کے زہرہ

کس ناز و نیاز سے پلے ہیں
اپنی اماں کے لاڈلے ہیں

کہتی نہیں میں یہ کچھ ہنسی سے
خدمت میں لونڈیاں ابھی سے

ہرچند نہیں یہ کہنے کی بات
کیا منھ سے کہوں کہ ہے بری بات

دن رات ہے ان سے پیار اخلاص
اک بات ہے ان سے پیار اخلاص

یہ لاڈ کبھی سُنے، نہ دیکھے! یہ کھیل تو کھیلتے نہ دیکھے
یوں ناز اٹھائیں جب کہ ماں باپ بچے ہوں خراب آپ سے آپ

زہرہ

کیا بات کہی ہے واہ بیگم! ہاں بات یہی ہے واہ بیگم!
لیکن اک بات پوچھتی ہوں تقصیر معاف ہو تو پوچھوں؟
دانا ہو کر بنی ہو نادان صاحب زادی کا کچھ نہیں دھیان
ہر چند کہ ہیں ابھی وہ کم سن مکتب میں بھی جانے کے نہیں دن
نکلی کم بخت بات میں بات اور بات بھی وہ جو ہے خرافات
مکتب بھی وہ جس میں قیس جائیں عشق الدین جہاں پڑھائیں
اول تو برا وہ مولوی ہے دیہاتی موا وہ مولوی ہے
باتوں کا نہیں ہے جسے سلیقہ کیا جانے پڑھانے کا طریقہ
ب آگے نہ کچھ کہے گی بندی عاقل کو ہے اشارہ کافی
لڑکوں میں لڑکیوں کا پڑھنا ہم نے تو کبھی سنا نہ دیکھا
حرمت کا بھی کچھ تمھیں نہیں ڈر بن بیاہی کو بھیجتی ہو باہر

بیگم

زہرہ سچ کہتی ہے تو بے شک مجھ کو نہ تھا اس کا دھیان اب تک
لیلیٰ خیر آج تو گئی ہیں اب جانے نہ دوں گی حشر تک میں
پڑھنے کا بہت ہے ذوق اس کو ہے شعر و سخن سے شوق اس کو
آتا رکھ لوں گی کوئی گھر پر اب جانے نہ دوں گی اس کو باہر

(زہرہ جاتی ہے، لیلیٰ آتی ہے)

بیگم

لیلیٰ مکتب میں اب نہ جانا
منظور نہیں مجھے پڑھانا

لیلیٰ (ماں سے مخاطب ہو کر)

جو آپ کہیں وہی ہے بہتر

(دل میں)

ہر چند کے ہو وہ شاق دل پر

ساتواں سین خواب گاہ لیلیٰ

لیلیٰ

قیس[1] پیارے اب ترا ملنا مجھے دشوار ہے

باپ ماں کی قید سے لیلیٰ بہت ناچار ہے

کہتی تھیں اماں تری نسبت کے آتے ہیں پیام

اب کہوں کس سے کہ شادی سے مجھے انکار ہے

یا الٰہی! قیس کے ساتھ آئے نسبت کا پیام

پھر نہ اس میں عذر ہے مجھ کو نہ کچھ تکرار ہے

زہر کھا لیتی نہ ہوتی گر ترے ملنے کی آس

ان دنوں کچھ زندگی سے جی مرا بیزار ہے

ہائے رہ رہ کے کلیجے میں مرے اٹھتا ہے درد

عشق کہتے ہیں جسے کیا وہ یہی آزار ہے

آٹھواں سین مکتب خانہ

(قیس مکتب میں آتا ہے، لیلیٰ کو نہ دیکھ کر گھبراتا ہے)

---

[1] صنف کلام: غزل مسلسل بحر رمل وافی محذوف۔ وزن: فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن، دو بار۔ قصد شاعر: اظہار حالت مجبوری و عشق

قیس (دل میں)

اے چرخ ستم پیشہ یہ کیا چال ہے تیری
مکتب میں نہ کیوں آج وہ طلعت نظر آئی

آخوند

اے قیس کہو تن ہے کہاں جان کدھر ہے
مکتب میں تو بیٹھے ہو مگر دھیان کدھر ہے

(قیس کے پاس جاکے)

کیوں روتے ہو کیا دکھ ہے تمھیں؟ منھ سے تو بولو

(دھمکا کے)

بے مار کی توبہ!.....

(طمانچہ مار کے)

.....چلو اب خوب سا رو لو

قیس (گریۂ بے اختیار)

قیس (دل میں)

ہم نے تو نہ کھائی تھی کبھی سیلیٔ استاد
اے حضرت عشق! آج یہ پہلی ہوئی افتاد

طرّار

آخوند جی صاحب خبر اس کی تمھیں کیا ہے
لیلیٰ نہیں آئیں وہیں دل اُن کا لگا ہے

خیلا (مجنوں سے)

ہم سنتے ہیں پردے میں بٹھائی گئیں لیلیٰ تا حشر تو مکتب میں اب آتی نہیں لیلیٰ

آخوند

لو آج کھلا، واہ! بڑا کام کروگے کیا قصد ہے صاحب مجھے بدنام کروگے؟

آوارہ مزاجوں کا پڑھانا نہیں اچھا بس جائیے یاں آپ کا آنا نہیں اچھا

قیس (دل میں)

مکتب[1] سے نکالے گئے اب منھ کسے دکھلائیں

اے حضرتِ دل! آؤ کہیں اور نکل جائیں

نواں سین درِ مکتب

حضرت دل! کہیے اب کیا آپ کا ارشاد ہے

آپ کے قابو میں اب یہ بندۂ آزاد ہے

پھر چلوں مکتب کو یا فرمائیے گھر کو چلوں

باپ کا ڈر ہے وہاں یاں سیلیٔ اُستاد ہے

شوق کہتا ہے کہ چلیے کوئے جاناں کی طرف

گو کہ یہ عینِ مرادِ خاطرِ ناشاد ہے

اپنی رسوائی کا ڈر ہے اس کی بدنامی کا خوف

بدگمانی ہے وہاں اور خنجرِ بے داد ہے

---

[1] صنف کلام: غزل مسلسل (مرقع یا خطابی، یہاں خطاب نفس یا دل سے)

قصد شاعر: اظہار حالت انتشار، ایک بڑی بات کا قصد تو کر لیا ہے مگر انجام دینے میں جو مشکلات درپیش ہیں ان پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے طبیعت کوشش کرتی ہے۔ ایسی حالت بیشتر اس وقت طاری ہوتی ہے جب کہ انسان کسی امر عظیم کے اقدام کا قصد کرے۔ مثلاً خودکشی یا قتل عمد۔

مجنوں ابھی کم سن ہے، اس کو گھر سے بھاگنا نہایت دشوار ہے۔ مانا کہ اس کو مکتب سے نکالے جانے کی بڑی شرم ہے، وحشت عشق اور بھی شہ دے رہی ہے مگر پہلے پہل گھر سے نکلنا بھی آسان نہیں ہے۔

مے کدے کو چلیے گر ہو بے خودی کی آرزو
بت کدے کو چلیے گر اس بت کی جی میں یاد ہے
کوچہ گردی ہو، اگر ہے سنگ طفلاں کی ہوس
سیر گلشن ہو جو ذوق نالہ و فریاد ہے
چلیے صحرا کو جو ہو سایہ ببولوں کا پسند
چلیے زنداں کو جو شوقِ زیورِ فولاد ہے
(پردہ گرتا ہے)

اتر پردیش اردو اکادمی کے زیر اہتمام شائع ہونے والے

دوسرے انتخابات

انتخاب کلام یگانہ چنگیزی	مرتبۂ انیس اشفاق	-/۶ ″
انتخاب بُستان حکمت فقیر محمد خاں گویا	مرتبۂ نیّر مسعود	-/۷ ″
انتخاب منظومات نظیر اکبر آبادی	مرتبۂ مسعود حسین خاں	-/۷ ″
انتخاب جعفر علی خاں اثر	مرتبۂ کاظم علی خاں	زیر طبع
انتخاب مضامین فکر تونسوی	مرتبۂ سردار دلیپ سنگھ	″
انتخاب مضامین احمد جمال پاشا	مرتبۂ عابد سہیل	″
انتخاب غبار خاطر		″
انتخاب کلام جگر مراد آبادی	مرتبۂ ایم۔ کوٹھیاوی راہی	″

ملنے کا پتہ:

اتر پردیش اردو اکادمی

۲۱۔ آر، کے، ٹنڈن روڈ، قیصر باغ، لکھنؤ ۱